

## فَاتِحَةُ الْفَتَنَّ



”او کھتے پھنس گیا آں.....“ میں ہر صبح یہ فریاد کرتا۔

”اں بھئی امریکہ کے رہائشی کدھر۔ شاہدی کھوئی میں آکے پھنس گئے ہیں۔“ میری فریاد کے جواب میں کوثر بھی یہ طنزیہ دار کرنے سے نہیں چوتھی تھی۔

کوثر... کوثر پروں..... جوانپی ماں کے لیے ”کونٹر“ بلکہ ”کونٹرے“ تھی کیونکہ ماں کی بولالی کی بھی لفظ میں ”نوں“ یا ”نوں غنہ“ ہونا لازمی بمحضتی تھی۔ جھوٹی والی ”فوزیہ“ ان کے لیے ”فوزیہ“ اور ان کے سرماج، یعنی میرے ماں جی محمد رحمت جنوبی کے لیے ”فوجیہ“ تھی اور اگر کہیں میں کوثر پروں کو ”کونٹر“ یا فوزیہ بانو کو ”فوجیا“ کہہ دیتا تو

”وَكَرَّتْرَكْ... كَرَكْ...“

حسب معمول میری آنکھ مرغیوں کے اس شور شراب سے کھلی جس دن مرغیاں میری نیند میں خلل ڈالنے نے باز رہتیں۔ اس دن وہ وابستہ طوطا اپنے طلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالتا، کسی مقابل نہم زبان میں کوئی سیق رہنے لگ جاتا۔ اگر کسی دن وہ بھی شرافت کے جا سے میں رہتا تو اس کھوتے کے پر کو بھلا کس کا ذریا خوف تھا جو وہ چپ رہتا۔ یہ کھوتے کا پر تھا محاورتا ”نہیں بلکہ حقیقتا“ نہ صرف کھوتے کا پر تھا بلکہ خود بھی ایک مکمل کھوتا تھا، یعنی گدھا۔

### مکمل ناول



دونوں نیچے جھاڑ کے بیرے پیچھے پڑ جاتی۔

”بپلواب اٹھ بھی جاؤ“ میں نے جھاڑو لگانی ہے صحن میں۔ تو بے دبیر تک سمجھی پہ پرے رہتے ہو، نیستی ڈال دی ہے سارے گھر میں۔“

وہ پیاس کے تنکوں کا جھاڑو کس کے باندھتی ہوئی بڑدا رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کی سانوںی مگر شفاف سی پیشانی مجھے دیکھتے ہی کیوں سلوٹوں سے اٹ جاتی تھی۔ املی کے پتے جسے ہونٹ ہرہ وقت بلبل کر کچھ نہ پکھ بڑدا تر رہتے، تجھی یہ بڑا ہٹ سرے کزرا جاتی اور کبھی سمجھ میں آجائی اور جب سمجھ میں آجائی۔ یہی سوچتا کہ نہ ہی سمجھتا تو اچھا تھا۔

”دبیر تک سوتا ہوں“ پتے نظر آتا ہے، آدمی رات تک منجی خالی پڑی رہتی ہے، یہ نظر نہیں آتا۔“ میں نے تنک کے پوچھا۔

”تجھے کیا ضرورت ہے آدمی آدمی رات کو اٹھ کے تمہاری منجی پتے نظردا لئے گی۔“ اس نے بھی شتنا کر جواب دیا۔

”سوانو ہوئے ہیں۔“ میں نے تنکے کے نیچے سے اپنی گھری نکال کے وقت دیکھا۔

”پتا نہیں دبیر کے کتنی ہو تم۔ اچھی طرح پتا ہے کہ میری رات کی ڈیولی ہوتی ہے۔ صحیح اذان کے وقت آکے سوتا ہوں۔“

”یہ تو اور بھی نہ سوت والی بات ہے۔ لوگ اذان کی آواز سن کر جاتے ہیں، اللہ کا نام لینے کی تیاری کرتے ہیں۔ تم اذان سن کر سوتے کی تیاری کرتے ہو۔ جب اس وقت جاگ جائیں ہو تو نماز پڑھ کے سو جایا کرو۔ فخر کی چار رکعتیں پڑھنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔“

یہ موضوع ایسا تھا جس پتے میری بولتی بند ہو جاتی تھی۔ میں نماز کے معاملے میں مجھ سے کوتا ہی ہو جاتی تھی لیکن ابھی دل اتنا سیاہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے لیے تاویلیں گھر کے خود کو حق پتے ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ جب بھی کوئی احساس دلاتا، میں جی بھر کے شرمندہ ہو جاتا لیکن کوثر پریوں کا معاملہ اور تھا۔ اس کے سامنے شرمسار ہو کر سر جھکانے کا مطلب تھا کہ اسے اور شیر کرنا، اس لیے میں ہر بار اس کے طعنے کے جواب میں وہی پکھ دہرا تا جو عمراً ”نماز نہ پڑھ سکنے والے“ نمازوں کا پلڑا ہلاکا کرنے کے لیے کھا کرتے

ہیں۔

”اور تم جو پانچ وقت نماز پڑھ لیتی ہو تو کون ساتیر مار لیتی ہو۔ دل تو تمہارا سازشی اور منافق ہے۔ جب تک تم مخلوقِ خدا کے ساتھ زیادتیاں کرنا بند نہیں کرو گی، تمہاری ساری باشیں بے قائد ہیں۔“

چارپائی کے نیچے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے اپنی چیل بر آمد کرتے ہوئے میں نے اس کامنہ بند کرنا چاہا۔

”تم نہیں لگے ہوئے ہو میرے فرشتوں کے..... جو تمہیں سارا حساب کتاب پتہ ہے کہ میری کون سی عبادت قبول ہو گی اور کون سی نہیں۔“

وہ ترپ کے بولی۔ چہرے پتے پیسہ کچھ اور بھی چمکنے لگا۔ جھاڑو کا دستہ اینٹوں کے فرش پر زور سے ٹھوکتے ہوئے اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”یوں تو چاچا نامم پاس بھی تین چار وقت کا نمازی ہے اور میں کل ڈا اس محلے میں آیا ہو اس کے سارے کرتوت جانتا ہوں۔ تم کون سا بے خبر ہو گی، یہ دیوار کے سرخ تو دیوار ملی ہے۔“

اب میں صحن میں بنے ”گھرے“ پتے سرکاری نل کے پاس نبوں کے بل بیٹھا منہ پتے لال صابن سے جھاگ بناتا ہے اور لکسار ہاتھا۔

”آگے پیچھے تو چاچا نامم پاس کی بڑی حمایتیں ہوتی ہیں۔ آج اس کے کرتوت یاد آگئے۔ تم سے تو لاکھ درجہ اچھا ہے۔ بندوں کے ساتھ اس کے معاملے جیسے بھی ہوں، اللہ کو تو نہیں بھولتا، نمازی ہے۔“

”ہاں پون“ ڈھانی نمازیں پڑھ لیتا ہے مگر حقوق العباد کی بھی بڑی اہمیت پتے لی بی کو شر۔“

میں نے نام کے ساتھ ”نون غنة“ ٹھوںس کر اسے اشتعال دلانا چاہا۔

”اب دیکھو، صحیح نصع اپنے ہم جویوں سے کو رس گیت گوا کر کسی تھکے ہارے مزدور بندے کو اس کی غیند سے جگانا کوئی نیک کام ہے۔ مرغیوں کی کڑک کڑک طوطوں کی میں میں، کتے کی بھوں بھوں..... گدھے کی ڈھینبوں دھینبوں!“

”اور ان سب سے مقابلے کے لیے ایک تمہاری ”درز“ کافی ہے۔“

میں ٹنملا کے پیچھے مردا اور اسے گھورنا چاہا مگر اس

عرف ”فوجیا“ کا تھا۔ وہ بھی اسکول سے چاہے کچھ سیکھ کر آئے نہ آئے راستے سے خبریں ضرور اکٹھی کر لایا کرتی۔ ”چاہے یہم پاس نے نئے کرائے دار“لب“ (دوہونڈ) لیے ہیں۔“

یہ دھاکا کرنے کے بعد وہ خود بھی چارپائی پر گر کے دھماکا ہو گئی۔ میری کراہ نکل گئی۔ ابھی پرسوں میں نے اپنی بان کی اس چارپائی کو کس کس کے سونے کے قابل بنایا تھا۔

”یاے ہائے، کون بد بخت ہستے چڑھا؟“

بامیں جانب کی دیوار سے باجی ساجدہ کا سر نمودار ہوا۔ یہ بھی عجیب و غریب کریکٹر تھا۔ دامیں جانب چاچائیم پاس کا گھر تھا تو بامیں جانب بھا حنیف رہا شپز رہتے۔ بھا حنیف خیر سے مولوی ٹائپ بندے تھے۔ اپنی بیگم جو محلے بھر میں باجی ساجدہ کے نام سے مشہور تھیں، ان کو رہ کرانے کی اپنی ہی کوشش کرتے تھے۔ گھر سے بلاوجہ نکلنے پر بندی ہی جس کا مد او اکرنے کو دیواروں سے لٹکا کرتی تھیں۔ چونکہ خود خیر اکٹھی نہیں کر کے لاسکتی تھیں، اس لیے کان یہاں لگے رہتے جسے ہی ماں بزری لے کریا فوزیہ اسکول سے لوٹتی، وہ تازہ نیشن سننے کے لیے نمودار ہو جایا کرتیں بلکہ وہ نہیں، صرف ان کا روپے سے نصف ڈھکا، رنگ برنگ کلیوں سے بجا ہوا۔

”یہ تو پتا نہیں، پر ریڑھے سے سامان اترتا یکھا ہے اور پتھر ہے ساجدہ، تین تین سنگھار میز تھے سامان میں۔“ اس انسٹاف پر باجی ساجدہ کی آنکھیں کا جل کے تالب سے ابھر کے باہر نکل آئیں۔

”تین تین سنگھار میزیں۔ یعنی ڈرینگ نیبل۔“ باجی ساجدہ آٹھ نوجماں تین پڑھی ہوئی تھیں، اس لیے اکثر الفاظ کا انگریزی ترجمہ کرنا نہ بھولتیں۔

”آہو.... ساروں کے شیشوں کے ساتھ پراندے لکھے ہوئے تھے، وہ بھی سلمی، ستارے اور تلے والے۔ لگتا ہے بہت ساری جوان کڑیوں والا بُرہے یا کسی شوقین مزاج نیشن زنانی کا سامان ہے۔“

”اللہ شکر خورے کو شکر رتا ہے۔ چاچا نام پاس کو بھی نام پاس کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا ہے۔“

”میل نہیں جاتا، مل جاتی ہے۔“ سیڑھیاں اترتے ہوئے سلمان نے باجی ساجدہ کے اس بیان میں اضافہ کیا۔

کوشش میں اس کا تو پچھہ نہ بگرو، لال صابن کا جھاگ میری راہنی آنکھ میں چلا گیا۔ مل کی طرح میری آنکھ بھی جل گئی۔

”اکھڑی تے لالی جاچپ کر کے...“

اب دیوار پار سے چاچا نام پاس کی رگ مو سیقی پھری تھی، ان کا پھٹی آواز والا سیپ ریکارڈر بے ہودگی پر اتر آیا تھا۔

”فلم اپنی بنائی جاچپ کر کے...“

میں گرم انتہے پالی کے جھپاکے مارمار کے اپنی آنکھ سے صابن نکلنے لگا۔ دوسری جانب اس بکواس گانے کی پریمنگم لے پر کوثر کے ہاتھ پکھے زیادہ ہی تیزی سے ہلنے لگے۔ پورے صحیح میں اس نے گرد اور دھول اڑا کے رکھ دی گئی۔ پتہ نہیں یہ صفائی کا کون سانیا طریقہ تھا کہ زمین کی مشی اٹھا کے فضائیں آلوگی پھیلائی جائے۔

”کوئی صاف تولیہ نہیں ہے؟“ گھرے نواری تولیے سے دور ہی آتے بھکے سے گھبرا کے میں نے پوچھا۔ تولیہ بھی نجاں کب سے نہیں دھلا تھا۔ اکڑ کے ریگ مال جیسا کھڑدا ہو رہا تھا۔ من کو خشک توکیا کرتا، چھیل کے رکھ دیتا۔

”ہے..... مگر گند ا نہیں کروانا، اس لیے نہیں نکالوں گی۔“ اب وہ جھاڑو جامن کے درخت کے تنے کے ساتھ کھڑا کرنے کے بعد غل کے نیچے بیٹھ کر پوچھا لگا نے والا کپڑا دھپر دھپ کر کے دھونے لگا۔ میں وہیں کھڑا تھا، کئی چھینٹے اڑ کے میری شلوار تک آئے۔

”اے..... آرام سے..... تمیز ہیں ہے کام کرنے کی۔“ سارے گندے چھینٹے میرے کپڑوں پر لگا ہیے۔

”تو تم نے کون سانماز پڑھنی ہے، ناشتا کر کے دوبارہ منجی پڑھنا ہے۔ کپڑے نیا ک بھی ہوں تو یہ کام آرام سے ہو سکتا ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی منہ توڑ جواب ریتا، ماں بتولیں بزری کی توکری اٹھائے ہائی کاپتی اندر داخل ہوئی۔

”اوھی“ تھی خبر۔

ماں نے آتے ہی پھولی سانسوں کے ساتھ اعلان کیا اور وہ یہ اعلان ہر روز تازہ بزری لانے کے ساتھ ہی کیا کرتی تھیں۔ بزری تازہ ملے نہ ملے خبریں روز تازہ بہ تازہ اور نئی نئی ہوتیں۔ یہی حال، ان کی چھوٹی صاحبزادی فوزیہ بانو

اور فوزیہ تو اس کے کاندھوں پر بیٹھ کے اسکو لے جایا کرتی تھیں۔

”وہ تب کی بات تھی، میں اب کی بات کر رہا ہوں۔ ان بابوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا اور وہ بھی چاچا نام پاس جیسے بابے۔ پسلے والی کرائے داریوں کے ساتھ اس کے قصے یاد نہیں؟“

اور اس کے بعد چاچا نام پاس کے ان تمام بھولے بسرے قصور کو تازہ کیا جانے لگا جو میں اپنے اس گھر میں پچھلے چھ ماہ کے قیام کے دوران بلا مبالغہ کم و بیش نہیں مرتبہ سن چکا تھا۔ اب تو مجھے بھی ایسا لگنے لگا تھا جیسے یہ سارے واقعات میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہوں۔ اگر مجھے خود کسی کو بتانا پڑیں تو میں ایسے ہی دُھرا سکوں گا جیسے مایی بتولائیں باتیں ساختہ سلمان خان پکے لے لے کر ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔

\* \* \*

میں حیدر، حیدر بخت چوہدری سکندر ڈونگہ بونگہ، میں اے پاس سینڈ ڈویریشن۔ پچھلے چھ ماہ سے لاہور کے علاقے شاہدی کھوئی میں بنے اس بختہ اور نیم بختہ مکان میں رہا۔ اس پذیر ہوں۔ کیونکہ یہ مکان میری رشتے کی خالہ اور دور در راز کے ماموں کا ہے اور ہماری خاندانی روایات کے عین مطابق رشتے داروں کا جس حد تک استعمال ہو سکے اور ان سے جتنا بھی فائدہ اٹھایا جاسکے، ضرور اٹھانا چاہیے۔

مجھے بھی جب لاہور میں نوکری ملی تو بے بے کا سب سے پہلا فرمان یہ تھا۔

”کوئی ضرورت نہیں اپنی ساڑھے تین ہزار کی تنخواہ میں سے کرائے بھرنے کی۔“ دیسے بھی تیری رات کی ڈیوٹی ہے، رات تو تیری کارخانے میں گزر جانی ہے، دن تھوڑی دیر سو کر، تھوڑی دیر گھوم پھر کے گزر جائے گا۔ تو میری چاچے کی دھمکی بتولائی کے گھر جا۔ وہی.... وہی تیری لاہور والی مایی، یاد نہیں۔ تاؤ وڈے کی پوتی کی شادی پر جو جامنی جوڑا پہن کے آئی تھی۔“

اب تاؤ وڈے کی آخری پوتی کی شادی کو بھی تقریباً ”نو سال ہو رہے تھے۔“ میں نے یادداشت پر زور ڈال کے جامنی جوڑے والی خالہ کا تصور کرنا چاہا۔ مگر ناکام رہا۔

”ہائے ہائے وہی.... وہ جو نہیں بڑا اچھا ڈالتی ہے۔ کسی

یہ حضرت ماسی بتولائی کے سب سے بڑے اور اگلوتے صاحبزادے تھے۔ اس محلے اور ہمارے خاندان کی روایات کے بر عکس ماسی بتولائی نے صرف تین عدد شاہی کارپیدا کیے تھے۔ حالانکہ وہ خاصی روایت پسند خاتون تھیں پھر پڑتے نہیں یہ روایت شکنی کسے کرداں انسوں نے۔ سلمان کا پورا نام محمد سلیمان جنہوںہ تھا مگر وہ خود کو سلمان خان کہلوانا پسند کرتا تھا اور اس مسئلے پر ماسی بتولائی اور مامار حمت کے مابین کئی پار شدید نوعیت کا شنازعہ بھی پیدا ہوا۔ چکا تھا اور ہر یار ماسی نزد تے پیٹتے ہوئے سلمان کو دھموکے جزے تھے۔

”وے بیڑا تریا.... بیو تیرا محمد حمت جنہوںہ دار اکرم دن جنہوںہ... تو کدھر سے خان پیدا ہو گیا ہے، بدھے دیکے میرے سر میں ”کھے“ والوانے۔“

سلمان جنہوںہ المعرف سلمان خان کو دو ہی شوق تھے، ایک تو اپنے آئندیں، ہیرو کی طرح بغیر شرت کے پھرنا اور دوسرے اسی آئندیں، ہیرو کی طرح آئے دن جیل کی ہوا کھانا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ مامار حمت کا بہنوئی یعنی سلمان کا پھر ستری بادشاہ ہے۔ یعنی تھانیدار ہے، اس لیے یہ ہوا زیادہ دن کھانے کی نوبت نہیں آتی۔ ویسے بھی اب تک وہ کسی ایسے غمین کیس میں اندر ہوا۔ بھی نہیں کہیات آگے تک جاتی۔ یعنی چوری چکاری، دیکھنی، راہنما، قتل و غارت یا منشیات کی اسٹنگ وغیرہ۔ وہ عموماً ”کسی نہ کسی گرز اسکوں یا گرز کا لج کے آگے کھڑے لوئندیں کے آپ لیش کھین اپ کے دوران پکڑا جاتا تھا۔“

”تم تو منہ بند ہی رکھو۔ ساری تمہاری پھیلائی ہوئی افواہیں ہی ہیں۔“ کوثر نے اپنے سے فقط تیرہ ماہ بڑے بھائی کو فریبت کر خاموش کرایا۔

”اچھا..... یہ افواہیں ہیں؟ سارے محلے کو پہنچے چاچا نام پاس کے کرتو توں کے بارے میں۔“ تھیں پتا نہیں کیوں اس کی ہمدردی کا بخار جڑھتا ہے۔ اماں! اس کا جانابند کرواؤ وہاں۔ بھی کڑھی دینے تو کبھی پرانے پکڑا نے پہنچی ہوتی ہے۔ چاچا بھی کوئی اعتبار نا بندہ ہے؟“

”نه پتہ ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ چاچا نام پاس عورتوں کے معاملے میں ذرا کچھ ایمان کا ہے لیکن محلے کی بچیوں پر اس نے کبھی نیت خراب نہیں کی۔ ساری اس کے سامنے میل کے بڑی ہوئی ہیں۔ اینی کو شری

بے بے نے مجھے پیاس رہا کر لا ہو روانہ کیا تھا۔  
لاشوری طور پر میں بھی گویا کسی الہائی میں اترنے کے  
لیے تیار تھا مگر یہاں اگر میرا سارا ساز و سامان (بچاؤ اور  
گھیراؤ کا) دھرے کا درجراہ گیا۔ ڈھنائی کا منظاہرہ کرنے کے  
سارے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔ ماما رحمت اور ماں  
بتولان دونوں نے کھلے دل اور کھلی بانسوں کے ساتھ مجھے  
خوش آمدید کیا تھا۔

یہ ایسا ہی محلہ تھا جیسا زراپلے حال والے متوسط طبقے کا  
ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگ محنت مزدوری کرنے والے تھے۔  
چند ایک عورتیں بھی دوسروں کے گھروں میں کام کرنے  
جایا کرتیں مگر انہیں قدرے خوشحال محلے دار اچھی نظر و نظر  
سے نہیں دیکھا کرتے تھے۔ یعنی طبقاتی فرق اس محلے کی  
حدود میں بھی پایا جاتا تھا۔ اکار کا گفتگو کے چند گھر انے جو  
سب سے معزز اور خوشحال سمجھے جاتے تھے، ان میں ایک  
ماما رحمت اور ماں بتولان کا گھر تھا۔ ماما رحمت کی ابتدی  
قصبے لودھڑاں میں بھی زینتیں تھیں، بہت زیادہ نہیں مگر ان  
کے بھائی جو ہر ماہ ان کے حصے کی آمدنی اور اناج کا حصہ بھیجا  
کرتے تھے، وہ آس پاس کے لوگوں پر ان کی زمینداری کی  
دھاک بٹھانے کے لیے کافی تھا۔ خود وہ دکانداری کرتے  
تھے۔ اسی محلے میں میں روز پہ ان کی کیانے کی دکان تھی۔  
ذنا ہے پہلے یہیں گلی میں چھوٹا سا کھوکھا ہوا کرتا تھا۔ اب  
ترنی دے کر جزل استور بنالیا تھا۔ ٹھنڈی بوتلیں اور  
جوں رکھنے کے لیے ڈسپ فریزر تو میرے سامنے قسطوں پر  
لیا تھا۔ پاہی کسی زمانے میں اجرت پر سالائی کڑھائی کا کام  
کرتی تھی، اب چھوڑ رکھا تھا۔ بڑے صاحبزادے بھی  
دکان پر بیٹھے، کبھی نہ بیٹھے۔ کبھی چھت سے اترے، کبھی  
نہ اترے۔ کوثر پر دین میڑک میں تیری باریل ہونے کے

کے گھر موت ہو "چھوڑی" (ماتم) وہی سمجھاتی ہے۔ یہ الگ  
بات کہ اپنی ساس کے مرنے سے اسے سانپ سونگھہ کیا تھا۔  
حرام ہے جو ایک جھونٹا آنسو ہی گرا یا ہو۔

"اچھا اچھا یہ مجھے یاد آیا۔ بے کی کسی چاچی کی  
وفات پر ہم لوگ برسوں پلے لا ہو رہتے تھے۔"  
"وہ والی ماں... جو کہ رہی تھیں کہ ساس کی ایک  
اچانک موت کی وجہ سے مجھے سکتہ ہو گیا ہے اور اسی سکتے کا  
اعلان وہ خوراکی زبان سے کر رہی تھیں اور سارے گھر میں  
پھر کی کی طرح گھوم پھر بھی رہی تھیں۔"

"ہاں ہاں وہی... تو کیا کرتی ہے چاری۔ اب رونا جو  
نہیں آرہا تھا تو کیا کہتی۔ جیتے جی چاچی اللہ بنخشنے نے جتنا رلانا  
تھا، رلایا۔ بس تو ادھر چلا جا۔ بتولان اتنے مزاج کی ہے پھر  
صرف وہی میری بہن نہیں لگتی، اس کا خصم، یا رحمت  
بھی دور کے رشتے سے میرا بھائی ہی ہے۔ تیرا ماما لٹتا ہے، وہ  
تو اپنی زنانی سے بھی زیادہ بہلا ماسی ہے۔ پچھے بھی تین ہی  
ہیں۔ بے چاروں کے اڑکا ہو گا کوئی تجھے سے دو تین سال  
چھوٹا اور اس کے بعد دو چھپکی جیسی سوکھی ماری پلی پلی  
لڑکیاں تھیں۔ ہورے کیا نام تھے، خاصاً وقت بھی تو ہو گیا  
ہے ملے ہوئے۔"

"اتنے سالوں سے آپ ان سے ملی نہیں، نہ وہ ہمارے  
گھر کبھی آئے۔ خاندان برادری میں کسی شادی یا مرگ پر  
ملاقات بولی ہو تو ہوئی ہو... اس پر بھی آپ کا اصرار ہے  
کہ میں ان کے ہاں جا کے ذیرے لگاؤ۔ پتہ نہیں ان  
لوگوں کا رویہ کیا ہو۔ شاید وہ پسند نہ کریں، تاک بھوں  
چڑھائیں۔"

"لغت بھیجا تام کے ناک بھوں پر۔ ذہیث بن کے  
گزارا کر لینا۔ پڑا آج کل اپنا کام نکلوانے کے لیے بندے  
کو ذہیث بننا ہی ہوتا ہے پھر تو نے کون سا چوبیں لے گئے ان  
کے سرپر سوار رہتا ہے۔ اپنا کام دھندا کرنا ہے۔ مرد ذات  
ہے، سارا دن سو کرتے نہیں گزارے گا۔ لا ہور شرپر ہے، روز  
شام کو نکل جایا کرنا گھونے پھرنے۔ اگر روئی پانی یوچھتی  
ہے تو تھیک ہے، سو لسم اللہ۔ کوئی احسان نہیں ہو گا اس  
کا۔ لوگ رشتے داروں کو سہماں بنالیا ہی کرتے ہیں اور اگر  
ذلالت دکھائے، نہ دے کھانا تو رفع دور۔ کسی تندور سے دو  
ٹیم روئی کھالیں مگر کرانے پر بھی کرہنے دھونڈنا۔ بڑا منگاشر  
ہے بھی۔ تیری آدمی، تنخواہ تو اسی میں برابر ہو جائے گا۔"

ادارہ خواتین ڈائیکٹ کی حرف سے بہنوں کے لیے عیند کا تخفیف

**مکمل خوبصورت و مقبول ناول**

\* میرے خوب ریزہ زیرِ مادہ مالک ۳۰۰۰ + لامائشل، مدعاہد ۱۰۰٪  
\* ایک دیباجلائے کھنماں مالک ۳۰۰٪ + شہر دل کے دروازے شاہزادہ ۱۰۰٪  
چادر دستاویل ایک ستائیہ منگوانے پر ڈاک خرچ فری  
\* خوبصورت سرور دق، خوبصورت پھیاں، مضبوط ببلد، آفٹ پر

شائع ہو گئے ہیں،

آج بھی قیمتی بکسٹاں سے حاصل فرمائیں،

مکتبہ عمران ڈائیکٹ فون ۰۳۶۱ ۲۲۱۶۳۶۶

اور کشادہ تھایا شاید لگتا تھا کیونکہ اس نے دوسرے لوگوں کی طرح ہر دو سرے سال کی خنے کمرے کاضافہ نہیں کیا تھا، نہ ہی کمروں کے اوپر کمرے چڑھائے تھے۔ پرانے بنے وہی تین محلے کھلے اور اونچی چھتوں والے کمرے۔ سامنے درمیں خانے والے فرش کا برآمدہ.... اس کے آگے لگی، اور ہر ہی ہوئی چھینی اور سامنے کھلا ساٹھن اور کچا احاطہ..... لال اینٹوں والے گھن میں ہندپپ لگا تھا جو آج کل کے زمانے میں بچوں کے لیے ایک غبوبہ تھا۔ کیا ریوں میں عجیب و غریب بد شکل جھناڑ جھنکاڑ پوڑے اُگے تھے جو یقیناً چاچا کی اجازت طلب کیے اور مرضی دریافت کیے بغیر خود ہی اُگ آئئے تھے۔ ورنہ چاچا انہیں اس دخل در معقولات کی اجازت ہرگز نہ دیتا۔ کچے احاطے میں مرغیوں، بیخوں، خرگوشوں اور گدھے نے قل کے کمال کا گند چایا ہوتا۔ سارے محلے میں پھیلی کھیاں اور پھراہی احاطے میں نموداری کے بعد اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے تھے۔

چاچا چھڑا چھانٹ تھا۔ پیدائشی نہیں، حادثاتی طور پر۔ نزدیک کے سب ہی رشتے جان چھڑا چکے تھے۔ شاریاں دو تین بار بڑے چاؤ سے کیسی مگر گھر آباد نہ ہو سکا۔ پچھے کوئی اللہ نے دیا ہی نہیں۔ اولاد کی کمی وہ اپنے بیالے ہوئے بدھیت جانوروں سے پوری کر لیتا اور بیوی تیکی کمی..... وہ بھی پوری کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا ہی رہتا مگر محلے والے آڑے آتے تھے۔ خود ایک کمرے میں رہتا باقی دونوں کمرے زیادہ تر کرائے چڑھے ہوتے مگر کوئی بھی کرایہ دار چند مہینوں سے زیادہ نہ لتا نہیں تھا۔

پچھلے محلے میں اس کے دو تین اور کوئی نما مکان کرائے پڑھے ہوئے تھے وہاں چونکہ کرائے داروں کا اس سے روز کاوا۔ طے نہیں تھا، اس لیے دل کڑا کر کے ڈٹے ہوئے تھے۔ ویسے بھی وہ محلہ پچھے زیادہ ہی غریب غرما کا تھا۔ زیادہ تر چھڑے چھانٹ مزدور پیش لونڈے لپاڑے رہتے تھے۔ کوئی دیواری دار مزدور، کوئی پھری لگانے والا.... دو چار مل کے ایک کوئی کوئی کرائے پڑے لیتے۔ یوں جیاں عورتوں کا عمل دخل نہ ہو، وہاں چاچے ٹیک پاس کانہ تو ٹیک پاس ہوتا۔ نہ کوئی دوسرا مسئلہ پیدا ہوتا۔

چاچے کے مکان کا ایک پچھلا دروازہ اس لگنی میں بھی کھلتا تھا جسے کھولنے کی نوبت عموماً "مینے" کے شروع کے دنوں میں آتی۔ جب کرائے کی وصولی کرنا ہوتی، درنے

بعد بھی شاید ہمت نہ باری گرمائی کی نظر جواب دے گئی۔ گھر کے کاموں میں باتھ بٹانے کے لیے اسکوں سے ہٹا ہی رہا۔ مجھے بھی بھی لگتا ہے کہ اسی وجہ سے چار سال پسلے جو کوثر پوین کا مودہ خراب ہوا تھا، اب تک خراب نہیں ہے۔ میں نے بھی اس کاماتھا سلوٹوں سے پاک نہیں دیکھا۔ پھولی سی خوبصورت ناک اپنے اونگ سمیت ہر وقت اور ہر چڑھی رہتی ہے۔ فوزیہ بانو اگرچہ اسکوں کی طالبہ ہے مگر کوثر سے کوئی بست سال چھولی نہیں۔ یہی کوئی تین چار سال کا فرق ہو گا۔ عمر کے لحاظ سے اسے اب تک اتنے میں ہونا چاہیے تھا یا اتنے پاس کر لینا چاہیے تھا اگر اس کی نوبت توب آتی جب وہ میزک پاس کرپاتی۔ اپنی ہمسیرہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ بھی پچھلے دو سال سے اسکوں کی آخری جماعت میں گوند سے چلکی ہوئی تھی اور اس سال بھی اس کا یہاں سے لس سے مس ہونے کا کوئی ارادہ نظر نہ آ رہا تھا۔ یہاں کی بجائے اس کا دل خاندان اور محلے میں ہوئے والی تازہ ترین سرگرمیوں میں زیادہ لگتا تھا۔ اس اضافی صلاحیت کی وجہ سے ماہی نے اسے اپنا استنست مقرر کر کھاتا۔

اس کے علاوہ بھا حنیف کا گھر انہے جوان کی بزرگ والدہ، بیکم المعرف ساجدہ بائی اور چودہ سے ڈیڑھ سال تک کے پانچ بچوں پر مشتمل ہے۔ بھا حنیف یہی فون کے محلے میں کام کرتے ہیں۔ عمدہ تو خاص نہیں۔ سرکاری تشوہابھی بس گزارے لائی ہے، اسی پر اکتفا کرتے تو سفید پوشی کا بھرم بھی بمشکل رکھ پاتے لیکن اپنی تمام تر نمازوں پر دے کی پابندی اور باتھ میں تھامی سیستھ کے باوجود اور کی آندنی کو خاص برائیں بھیتے، اس لیے گھر میں آسودگی ریل جیل ہے۔ پانچوں پچھے اس علاقے کے سب سے ابھے انکاش میڈیم اسکوں میں پڑھ رہے تھے۔ نیا چھماتا ہنڈا موڑ سائیکل تھا۔ گھر کی دوسری منزل میں دو سال پسلے ہی تین کمرے دال کے باہر نہیں ناٹیں بھی لگوالی تھیں۔

ایک چاچا یہ پاس تھے جو تھے تو کھاتے تھے، خوشحال قسم کے، مگر مارہ مت اور بھا حنیف کی طرح تھے میں باعزت نہیں بھختے جاتے تھے۔ ویسے انہیں اپنی عزت کروانے کا خاص شوق بھی نہیں تھا، وہ نہ کوئی تو غزت کروانے لائی کام کرتے۔

چاچا کا مرکان اردو گرد کے مرکان کے مقابلے میں خاصا بڑا

سے دہراتے ہیں مگر چاہا کے پاس روز نئے سے نیا قصہ ہوتا اور میں یہ جانتے ہوئے بھی اور کپی اور مرعوبیت سے سنتا کہ یہ سوائے جھوٹ اور کپ بازی کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ بھی جو فلم ہم تک باندھ کے تین گھنے تک دیکھتے ہیں، وہ کیا ہوتی ہے... نری کپ۔ پھر بھی ہماری محیت کم نہیں ہوتی اور چاچے کی جوانی کے قصے تو تھے بھی بڑے چٹ پٹے۔ ماسی نے دبے لفظوں میں کئی بار مجھے ٹوکا۔

”چاچے کے ساتھ زیادہ اٹھا بیٹھا نہ کر“ اسے تو محلے اور بپادری کا کوئی ہوش مند منہ نہیں لگاتا، خراب کروے گا بخھے۔ میں تیری ماں کو کیا جواب دوں گی۔“

میں نہ کے ٹال رہتا۔ میرا دل لکھتا تھا وہاں دیے بھی میرا خیال تھا چاچے کو کسی نے تھیک طرح سے کجھا نہیں۔ اس کے بارے میں مشور انواع ہوں کی حقیقت بھی میرا چاچے کو ٹوٹ کر جان چکا تھا۔ رائی ضرور تھی مگر اس کا پھر اکرنا محلے والوں کافن تھا۔

دوسرے تیرے دن میں شام کو گھونٹے بھی نکل جاتا، لاہور کی بیان اور کڑیاں دیکھنے۔ وہیں سے گھومتے گھماتے ڈیوٹی پر۔ غرض میرا بھی وقت اچھا پاس ہو رہا تھا۔

سازھے تین ہزار روپے پہ ملازم ہوا تھا مگر تیرے میں ہی جب نوکری پکی ہوئی تو تشوہ بڑھ کے پونے پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کی خبر میں نے کسی کو نہیں دی۔ پہلے کی طرح کھربہ دو ہزار ہی بھجو رہا ہوں۔ کیا کروں، ایک بیٹے سے بڑھ کر ماں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ مجھے بھی اپنی ماں کی عادت کا پتہ ہے، دو چھوڑ دس ہزار بھی بھیجوں تو سارے کا سارا چولہے میں جھونک دینا ہے۔ ایک تو یہ زبان کا چکا... پتہ نہیں کون یہ سمجھ دار ماں میں ہوتی ہیں لوگوں کی جو آنے آنے خود بھی جوڑتی ہیں اور اولاد کو بھی سکھاتی ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کا پچھہ بننے دیکھا ہے۔

میری اباں کا تو وہ حال ہے کہ چارپیے ہاتھ میں آئے تو بھاگیں قصاری کی دکان پہ۔ گلوگوشت تلوایا اور بھون کے کھالیا۔ حلوبہ بنوایا اور پتے چھڑک کے کھالیا۔ نہ خود اپنے کپڑے پہننے کا شوق، نہ اولاد کو پہنانے کی چاہ نہ اپنا زور بنانے کی خصی جائی، نہ دوجوں ہوتی بیٹیوں کے لیے بنا کے رکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ گھر کے لیے کوئی چیز لانا تو قطعی فضول سمجھتی تھیں۔ میں اپنے دونوں بڑے بھائیوں کا اشر دیکھ چکا تھا۔ پچھلے چھ سات سال سے ان کی محنت کی کمائی پہل پل کے ہمارے علاقے کے قصاری پر بیرون والے اور

دوسرے دنوں میں اس کی جھلنگاں چارپائی اسی دروازے پر موریے کی طرح رہی رہتی اور وہ آتی جاتی عورتوں کی آنکھ میں خار کی طرح ھٹلتا رہتا۔

بے شک اپنی کنجوں اور درویشانہ طرزِ زندگی کی وجہ سے وہ بڑے حالوں میں رہتا تھا لیکن تھا تو صاحبِ حیثیت، صاحبِ جائیداد پھر محلے بھر میں اسے اچھی نظر سے کیوں نہیں دیکھا جاتا۔ یہ سوال ابتداء میں مجھے خاصاً سنگ کرتا تھا۔ ماسی کے گھر میں بھی اس کی خاصی وقعت نہ تھی لیکن نصیب سے وہ ماسی کا دور رہے کا چاچا لگتا تھا۔ اب رشتے داری تو ختم نہیں ہو سکتی تھی، عمر کا فرق زیادہ نہ ہونے کے باوجود ماسی بتوالاں دھڑلے سے اسے چاچا کہتی آئی تھی اور اسی کی وجہ سے وہ پورے محلے کا چاچا اور پھر اپنی حرکتوں کی وجہ سے چاچا یہم پاس بن گیا۔

یہاں آنے کے بعد میرا اپنا شیم بھی چاچے کی وجہ سے اچھا پاس ہونے لگا۔ پہلے تو میں نے اس انتہائی گندے رہنے والے اول جلوں سے ادھیڑ عورت خنس میں خاص دلچسپی محسوس نہ کی مگر پھر اس کے بارے میں مختلف لوگوں سے نے مختلف قصوں نے دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔

میں جسیکاً گارمنٹ فیکٹری میں ملازم ہوا تھا، وہاں میری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ شروع شروع میں طبیعت بیزار ہوئی، روئین سیٹ ہوتے ہوتے وقت لگ گیا لیکن اب میں مزਬے میں تھا۔ شکر کرتا تھا کہ عام لوگوں کی طرح دن میں ڈیوٹی نہیں بھگتا تا۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ سارا دن گدھوں کی طرح محنت کرو رات ہوتے ہی سورپزو۔ میں رات نوبجے سے صبح پانچ بجے تک کام کرتا تھا۔ نائٹ شفت کے لیے تشوہ بھی ڈے شفت کے مقابلے میں نسبتاً ”زیادہ تھی۔ ماسی کا گھر زیادہ دور نہیں پڑتا تھا۔ واپس آگر منہ ہاتھ دھوکے، فیکٹری کے میلے کپڑے بدلنے اور ناشستہ کرنے کے بعد میں سات یا ساڑھے چھ بجے تک سو جاتا تھا۔ دن کی نیند، رات کی نیند جیسی بھری نہیں ہوتی۔ تین چار انگڑیاں لیتا اٹھ جاتا۔

وہ پسرا کا کھانا کھانے کی روئین نہیں رہی تھی۔ چائے کا کپی پی کے پچھے ماسی کے دکھڑے سنتا، پچھے کوثر پوچن سے چورچ لڑائی جاتی۔ اس کے بعد کاتانگم پاس کرنے کے لیے اپنے طولانی مکر چٹ پتے قصے از بر تھے اسے کہ کیا کہنے سنا ہے بڑے بوڑھے ہزار بار کے سنائے قصے ہمیشہ بڑی رغبت

کوڑ شام کو محلے کے بچوں کو نیوش پڑھایا کرتی تھی۔ میں اس وقت کم ای گھریہ ہوتا۔ آج کسل مندی سے چھن میں پچھی چارپائی پہ رہا تھا۔ فوزیہ نے ابھی بھی یہاں چھڑ کاکر کے پیدائش قین چلایا تھا۔ نیچے پچھی دریہ کوڑ بڑی مدیری بی دسری جماعت کی کسی کندڑ میں بچی کو انگریزی کا سبق پڑھاری تھی۔ ایک تو اس کا انگریزی کا الجہی کرنے تھا، اور سے ساتھ ساتھ کڑھائی کا شغل بھی جاری تھا۔ کسی نائکے میں بھی وہ سخت بے زاری سے اسے یہ رٹالگواری تھی۔ مجھے سن کرنی آرہی تھی۔

”نالائق..... ہی ازبوانے..... ہی ازبوانے۔“

اس کے تیل سے بچ بچ کرتے سر پر اس نے دو چارچبت لگا کے پھریہ جملہ دہرا�ا۔

”اب بول مریو... ہی ازبوانے..... بوانے.....“ اس نے بوانے کو نیبا کھینچتے ہوئے کہا۔

”صحیح طریخ بولی نہیں تو سوئی چبھو دوں گی ڈیلے میں۔“ اس نے اپنی شاگرد کو دھمکانے کے بعد مجھے گھورا۔

”تمہیں بڑی نہیں آرہی ہے؟“

”ویسے تو تمہاری انگریزی سن کرونا آرہا ہے، کہتے ہیں مغرب کے وقت رونا مکروہ ہوتا ہے، اس لیے نہ کر کام چلا رہا ہوں۔“

”مغرب کے وقت یعنی اور نائکیں ہلانا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ یہ بات کسی سانے نے نہیں بتائی۔ اورے شبیو... بیٹھ جا، نائک توڑ دوں گی جو دوبارہ ہلا تو... پورا صفحہ لکھ کے دکھا۔“

بات کرتے کرتے اس نے گھٹنے کے نیچے رکھا ڈنڈا نکال کے مژیل سے شبیر کی سوکھی نائک پہ مارا۔ وہ درد سے دہرا ہو گیا۔

”مکرنا کریں کام پورا کر اپنا۔ مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں۔ تیرے جیسے نالائق کے ساتھ ہی لگی رہوں۔ ایک تو قیس وقت پہ نہیں لاتے“ اور سے دماغ کھا جاتے ہیں۔“

”انتاشددا رودہ بھی نہیں معصوم بکوں پہ۔ ان کے لیے اتنا کافی ہے کہ یہ اس وقت تمہارے رحم و کرم پہ ہیں۔ ایک تو انہیں الثا سیدھا پڑھا کے ان کا مستقبل خراب کر رہی ہو، اور سے یہ ماری۔“

”تم باہر کیوں نہیں جاتے، کیوں میری نیوش خراب کر رہے ہو۔“ وہ اپنے شاگردوں کے سامنے میری صاف گوئی پہ جھنجرا گئی۔

دو دھن والے کے دن پھر گئے مگر ہمارا گھر وہی بھٹدار کا بھٹدار... نوٹی چارپائیاں.... زنگ آلوڈ میں کے ٹرکوں میں پرانے کپڑے لئے نہ ہونے ہوئے۔ چند ایک پچکے ہوئے موڑھے۔ (بس نے اپنے ساقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اخبار پڑھا رکھا تھا) ترمال پکتا مگر تام چینی کی ٹیڑھی میزھی پیلی پلینوں میں ڈال کے کھایا جاتا۔

میں دو ہزار گھن بھج کے بالکل مطمئن تھا۔ میرا صمیر مجھے مال اور بہنوں کے ساتھ اس بے ایمانی کے مظاہریے پہ زرا بھی شرمندہ نہیں کرتا تھا، اس لیے کہ میں یہ رقم اپنے تللوں میں نہیں اڑاتا تھا۔

ماں میرے ناشتے کھانے اور چائے کا خیال رکھتی تھیں پھر بھی زیادہ تر میں ناشتہ ہی ان کے ہاں سے کیا کرتا تھا۔ وہ سر کو کھانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ سپر کو جہاں بیٹھا ہوتا، چاچے یہاں پاس کے ساتھ یا کسی اور دوست کے ساتھ۔ وہیں چائے کے ساتھ پچھلے ہلکا ہلکا لے لیا۔ ایک آدھ بیکٹ یا سوس..... رات کو اگر گھر میں ہوتا تو جو ڈال روئی وہ پکاتے، صبر شکر کے ساتھ کھا لیتا۔ ویسے آپس کی بات ہے، کوڑ یوں کے ہاتھ کی ڈال بھی کسی مرغ مسلم سے کم نہیں ہوتی۔ باہر آوارہ گردی کر رہا ہوتا تو نان چنی یا دس روپے والا بر گر لے لیتا۔ ہوں کھانے پینے پہ میرا خرچا نہ ہونے کے برابر تھا۔ پان سکریٹ کا شوق تھیں تھا۔ نوکری پہ جانے کا مخصوص لباس تھا۔ آرھاں لٹلی بنیان میں گزر جاتا۔ باہر جاتے ہوئے پہنے کے لیے بتلوں میں شر میں لیتی ہوں تو لیڈا بازار زندہ باد۔ لا ہور کی سے اچھی چیزیں مجھے یہی نہیں۔ یہ کام بھی مہینے میں ایک آدھ بار ڈیڑھ سورہ پہ میں ہو جاتا۔

یوں میں اپنے پاس موجود ستائیں سو میں پیسے خاصی رقم بچا لیتا تھا۔ جانیا تھا اپنے پاس جمع شدہ رقم بھی بھی ایمان خراب کر سکتی ہے۔ خرچ کرنے پر اکسالستی ہے، اس لیے میں نے دو جگہ کیٹھی ڈال رکھی تھی۔ دل میں ارادہ تھا کہ ایک کیٹھی نکلے گی تو موڑ سائیکل لوں گا اور دوسری والی سے بس کے لیے کوئی چیز۔ کسی سکھریانی مال کی طرح میں نے بہنوں کا جیز بنانے کی ٹھان لی تھی۔ دونوں مجھ سے چھوٹی تھیں مگر اب شادی کی عمر کو پہنچ رہی تھیں۔



”ہی ازبوانے..... چھٹی پڑھو... ہی ازبوانے.....“

تو آپ نے میری ہی گٹ پکڑنی ہے۔ میں ذرا اسے ڈر رہی ہوں تما را اور انہیں پوچھ لے لو جو باقاعدہ بھی لگایا ہو۔“  
اور واقعی وہ یہ کہم کھا بھی سکتی تھی، اس نے ہاتھ ہرگز نہیں لگایا تھا۔ آئھوں جماعت کے عرفان کی حساب کی مولیٰ سی کتاب ہی تو ماری تھی۔

بڑی مشکلوں سے باجی ساجدہ کے ساتھ کے مل دوڑ ہوئے۔ وہ بڑی گھڑی کی طرح کسی نہ کسی طرح دیوار سے ٹیکیں تو کوثر نے خشمگین نظروں سے ان کی ہونہار صاجزادی کو گھورا اور دانت پھکچا کر گویا اسے پیس کر رکھ دینے کی خواہش پر قابو پایا۔

میرے دل میں بست سے نوکیلے فقرے پھل رہے تھے لیکن اس کی حالت دیکھ کر خود کو روکتا وہاں سے اٹھ گیا۔ ایسا میں نے اس پر ترس کھاتے ہوئے نہیں کیا تھا بلکہ اپنے بچاؤ میں کیا تھا کیونکہ میری کسی بھی اگلی اشتعال انگیز حرکت کے شیئے میں وہ سارا غبار مجھ پر نکال دیتی۔

“آخر کوثر کو یوش پڑھانے کی ضرورت کیا ہے۔“  
میں نے ماں سے پوچھا۔ ایسی عالم فاضل تو وہ نہیں تھیں کہ علم امداد اپر رہا ہو اور وہ لٹانے کو بے قرار ہو اور نہ گھر کے حالات اپنے اپنے تھے۔ جیسا ان کا طرز زندگی تھا، اس لحاظ سے آمدی گزارے لاٹنے سے زیادہ ہی تھی۔ یعنی چتنے پاؤں پھیلانے کے وہ عادی تھے، چادر اسی سائز کی تھی۔

“ضرورت کیا ہونی ہے، ادھر کون ساروں کی تھوڑہ ہے۔ لڑکیوں بالیوں کے اپنے ارمان ہوتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کے اپنے کی گماں سے اتنا بخ جاتا ہے کہ میں کبھی بستر، کبھی کبل، کبھی استری، کبھی برتن، پانڈے لے کر پیٹی میں ڈال لیتی ہوں۔ تھوڑا بہت زیور میرا پڑا ہے، چار چار چوڑیاں ان کی بنائی ہیں پھر بھی آج گل جتنا ہو، اتنا لوگوں کو تم لکھتا ہے۔ نوابوں کے گھر بھی دو تو اگلے بھوکے نگوں کی طرح آس لگائے ہوتے ہیں کہ بھو غسل خانہ دھونے کے لیے برش بھی ساتھ لے کر آئے۔“  
میری نہیں چھوٹ گئی۔

“ہنسنے والی نہیں، رونے والی بات ہے پڑا میری ایک جانے والی رنفیہ (غالباً ”رفیعہ“) نے ابھی پچھلے دنوں بچی دیا ہی ہے۔ ہائے یاۓ.... باوری جی خانے کے سامان میں دیا سلاٹی تک رکھی تھی۔ نالی پالی (ازار بند ڈالنے کی سلاٹی) بھی سوجوڑوں پر بخار کھی تھی۔ لڑکے کو جو سامان دیا، اس

”وے ہے جتنی محنت تم ان پر کلتی ہو، اتنی خود کر لیتیں تو شاید میزک پاس کملائیں۔“  
”میں نے میزک پاس کیا تھا۔“ وہ ڈھنائی سے زور دے کر بولی۔

میں مسکرا رہا تھا جیسے اس کے اس دعوے کی اصلیت سے اپنی طرح واقف ہوں۔ میری مسکراہٹ پر اور بھی خجل ہو کے اس نے بادا جہا اپنے ساتھ بیٹھی بچی کو مولیٰ سی کاپی دے ماری۔

”بشر بشر کیا دیکھ رہی ہے؟ یہ سوال حل کر۔“  
اس وقت وہ بھول ٹھی تھی کہ وہ فتنہ پچی ساجدہ باجی کی دختر نیک اختیار تھی۔ اس نے تیسری کی طرح سکیاں روک کے چوت سلانے کی بجائے گلا پھاڑ کے فریاد بلند کی۔ باجی ساجدہ کا سرفوراً دیوار کے پار سے نمودار ہوا جیسے وہ اسی انتظار میں بیٹھی ہوں۔

”کوثر..... تمہارا ہاتھ برا کھلتا جا رہا ہے۔ ذرا سی بچی کو بے دردی سے مارتی ہو۔ نہ بھئی..... میں نہیں پڑھاتی انہیں..... بہترے ملتے ہیں یوش پڑھانے والے۔ ان کے اسکوں کی مس تر لے داکتی ہے۔ وہ تو میں محلے داری کا لحاظ کر کے یہی۔“

یہ دھمکی بڑی کارگر رہتی تھی۔ یوں تو کوثر پر دین کسی کی دھمکی کو جوتو پر نہیں رکھتی تھی لیکن باجی ساجدہ کے ایک دو نہیں پورے پانچ کے پانچ نکے یہیں آتے تھے۔ چار تو اسکوں جاتے تھے۔ پانچواں یوں یہی چھوٹی سی سلیٹ اور چاک اٹھا کے حرص میں آ جاتا۔ اسے اگلے سال اسکوں بھینخ کا ارادہ تھا اور باجی کا خیال تھا، تب تک یوش میں آنے کی وجہ سے اسے دو گھڑی نیک کے بھینخ کی پریکش ہو گی۔ یہ مخف ان کا خیال ہی تھا۔ وہ نہ خود نیک کے بھینخا، نہ کسی دوسرے کو بھینخ دیتا۔ کبھی اس کا قلم توڑ..... کبھی اس کی سیاہی گرا..... کبھی فلاں کا قاعدہ پھاڑ..... بھی ڈھمکاں کے دانت کاٹ..... اور تو اور ہر دوسرے دن گلا ہو کے گند بھی پھیلا تا۔ کوثر بڑھ کرتی فرش صاف کرتی لیکن پھر بھی آنے سے منع نہیں کرتی۔ بغیر پڑھائے وہ اس کے پورے سو روپے دصول کرتی تھی۔ باجی چاروں کے دو دوسروپے جبکہ دوسرے آنے والے پانچ پچاس ساٹھ سے زیادہ نہیں دیتے تھے۔

”باجی، زور سے نہیں مارا..... یہ تو ایسے ہی گلا پھاڑ نے لگتی ہے۔ ذرا دھیان نہیں دیتی پڑھائی پر۔ نیل ہو جائے گی

ہی اپنا سر تکیے پر کھا اور کھیس منہ تک مان لیا۔ ماسی مل میں ابنتی خبر لیے سامنے چوکی پر بیٹھی رہ گئیں اور یہ غلطانہ تھا۔ کئی گھنٹوں کی نیند لے کر جب میں جا گا تو انہیں اسی چوکی پر اسی انداز میں بیٹھے دیکھا۔ پہلے تو مجھے لگا کہ جیسے میری آنکھ گھڑی بھر کو لگی ہو گی لیکن وقت دیکھا تو سوا گیارہ ہو رہے تھے۔

”ارے ماں! آپ اب تک یہیں بیٹھی ہیں؟“

”تیرا سر کا درد کیسا ہے؟ لگتا ہے آرام آگیا۔ لے پھر سن، یہ جو چاچا ہے نا جس کی تو بڑی حمایتیں کرتا ہے، اس نے وہ کیا ہے جو ہماری برادری میں بھی کسی نے نہیں کیا۔ جس جس کوپتہ ہے کہ یہ ہمارے شریکوں میں سے ہے وہ سارے میری سات پیر ہیوں کو تھوک رہے ہیں، شرم آرہی ہے مجھے یہ سوچ کر کہ یہ میرے باپ کا شریکا بھائی لگتا ہے۔ توبہ... توبہ...“

”کیا چو تھا نکاح کھڑکا لیا چاچے نے؟“ میں نے لمبی سی جمائی لینے کے بعد پوچھا۔

”وہی کر لیتا تو اچھا تھا۔ چلو وہ تو شرعی حکم ہے، اس میں کیا عیب۔ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے بدھی عمر میں دوہی لانے پر لعن طعن کرتے لیکن یہ جو اس نے کیا ہے، ہائے میں مرحاواں۔“

وہ دونوں ہتھیلیاں رگڑ رگڑ کے افسوس کر رہی تھیں۔ ”کرانے دار آگے ہیں اس کے۔“ انہوں نے اطلاع دی۔

”وہی تین چار سنگھار میزوں اور شیشوں کے پراندوں والے؟“ مجھے دو دن پہلے کی ان کی بات یاد آئی۔

”کیا ہوا، کیا ٹھیک عورتیں نہیں ہیں؟“ میں نے رازداری سے پوچھا۔

”عورتیں ہی نہیں ہیں۔“ جواب بھی اسی رازداری سے ملا۔

”کیا مطلب، کہاں گئیں؟“

”کھوہ (کنوں) میں۔“ ماسی نے جل کر کہا۔

”چاچے ٹیم پاس نے خرے (بیجڑے) کرانے دار رکھ لیے ہیں۔“ وہ رونے والی ہو گئی۔ خبر جبرت انگیز ضرور تھی مگر دردناک نہیں، اس لیے ان کی رقت بھجھ سے باہر تھی۔ میرا دل تو تھقہے لگانے کو چاہ رہا تھا۔

”اس محلے میں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اب ادھر طینے کھڑکیں گے، تالیاں پیٹھی جائیں گی، بھیک لکیں گے۔“

میں طرح طرح کے جوڑوں، جو تیوں اور خوشبوؤں کے ساتھ سویا راڑھی منڈنے والا بلید بھی رکھا تھا جیسے اس سے پہلے تو اسے بھی نصیب ہی نہیں ہوا ہو گا۔ یہ جیزرو یکھ کر میں نے تو پولے منہ سے رفید کو کھہ دیا۔

”زلزلے میں تباہ ہونے والے خاندان کو لڑکی دے رہی ہو؟ جب ہی جیزبر امدادی سامان کاشک ہوتا ہے، تو بس پر حیدر بخاں..... یہ حال ہے ہم سفید پوشوں کا کہ اب پچیاں بھی اپنے جیزکے لیے خود ہاتھ پیر ماریں تو گزارا ہوتا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہمارے وقوتوں میں ماں میں شادی کے لیے جب دو پئے رنگوں کے دیڑے میں سوکھنے والی تھیں تو ہم شرم کے مارنے کرنے سے نہیں نکلتے تھے کہ باہر جیزکی تیاری چل رہی ہے۔

ماں بچیوں سے بہانے بہانے سے ناپ لیتی تھیں کہ لحاظ رہے۔ شرم تو اب بھی ہے بچیوں میں مگر ضرورت..... میک ہاہ..... یہ بے چاری ٹیوشنیں پڑھا کے جو ہزار روپیہ کا لیتی ہے تو ہر میںے ایک بڑھیا جوڑا بن کے ٹنک میں چلا جاتا ہے۔ بھی کوئی مہنگی بستر کی جا در، بھی تھرماں، بھی شیشے کے گلاس، بھی چینی کے ڈونگے.... جتنے جو گی ہے، اپنا بندوست کر رہی ہے۔“

ماں کی باتوں نے مجھ پر ایک نیا درکھول دیا۔ میں نے جو اپنی بہنوں کے لیے شاندار نہ سی، بھرم رہ جانے کے قابل جیز بنانے کے جوارا دے باندھے تھے، وہ ایکدم پھس پھے لگنے لگے۔ اگر یہی زمانے کا چلن ہے تو میں کب تک اس قابل ہو پاؤں گا کہ..... میرا دل بھھ کے رہ گیا۔

\* \* \*

”لے.... ہور سن، یہ تیرے چاچے ٹیم پاس نے کیا چین چاڑھا ہے۔“

میں نیند سے زیادہ تھکن سے نڈھاں تھا۔ یہ تھکن جسمانی نہیں، اعصابی اور رذہنی تھی جو کل ماسی کی باتیں سن کر مجھ پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ ساری رات میں دھیان سے کام نہ کر سکا تھا، اب ماسی کی باتوں پر دھیان کیا رہتا۔

”میرے سر میں خت درد ہے ماسی! اس وقت مجھے دن میں تارے نظر آرہے ہیں۔ چاچے کا چین پھر کبھی دیکھ لیں گے۔“

میں نے ناشتے کو نظر انداز کرتے ہوئے چائے کا گل لبوں سے لگایا اور گرم گرم شیرہ نما چائے حلق سے اترتے

”وہ تو پسلے بھی اکثر لگتے ہی رہتے ہیں، ہر خوشی کے موقع پر سکے رہتے داروں سے پسلے کی خدائی فوجدار پہنچے ہوتے ہیں۔“

”وہ اور بات ہے لیکن اب شرف لوگوں کے برابر تن کے رہنے گے یہ۔ دھیوں، بہنوں والے گھروں کے سامنے بیس ٹگے اور ایسا صرف چاچے نہیں پاس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہ آپ شغلی اور رونقی ہے۔ اپنا دل بسلانے کو یہ میراث خانہ گھر میں گھسالیا ہے۔ ہائے ہائے۔ میری تدویار سے دیوار میں ہے۔“

”تو وہ کون سا دیوار پھانگ کے اوہر آ جائیں گے۔“ میں نے ان کی نکر مندی کم کرنا چاہی۔

”بڑا اثر رہتا ہے ہمایوں کا۔ بس ہم سارے محلے داروں نے اپنا کریا ہے کہ نہ صرف چاچے کے یہ نئے کرائے دار بلکہ چاچے کو بھی یہاں سے نکال باہر کرنا ہے۔“

”یہ آپ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ وہ اپنے ذاتی مکان میں بینجا ہے اور قانون کی رو سے اپنا مکان کسی کو بھی کرائے پوے سکتا ہے۔ ہاں اگر یہ نئے کرائے دار کسی غیر قانونی کام میں ملوث ہوتے تو یہ تقدم اٹھایا جا سکتا تھا لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، قانون میں اب تک شادی بیاہ پر ”ولیس“ لوئے داول پر کوئی حد نہیں ہے۔“

”دفع دوں... چولئے میں جائے قانون۔ یہ ہمارا محمل ہے، ہماری مرضی کہ ہم کے رکھیں اور کے نکالیں۔ بھلا شرف لوگوں کے محلے میں خروں کا کیا کام۔“

”کہیں تو رہنا ہی ہے غربوں نے۔“ کوثر نے برتن مانجھتے مانجھتے رحل دیا۔

”اس محلے میں نہ سی تو کسی اور محلے میں۔ اگر سب لوگ انہیں نکالتے رہے تو وہ جائیں گے کہاں، ان کے لیے الگ محلہ یا شرتو بننے سے رہا۔“

”تو چپ کر، وڈی آئی ہمدردن چاچے کی۔“ ماں نے اسے جھٹک کے رکھ دیا۔

”بھا ضیف کرتا ہے۔ کل سوری سے پہاں پہلاں وہ خروں کی ڈولی ادھر سے اٹھوا کے رہے گا۔“

”ہاں اس جیسا رائی دھڑلے سے یہاں رہ سکتا ہے اور ہر آتے جاتے سے گردن اکڑا کے سلام بھی وصول کر سکتا ہے۔ ماں کا اپنا بیٹا سلمان خان رہ سکتا ہے جس نے اس محلے کی کسی کوڑھی لڑکی کو بھی چھیرنے سے نہیں بخشا۔“

لال دین قصائی رہ سکتا ہے جو مردہ مرغیاں اور بائی گوشت نزدیکی ہو ٹلوں میں فروخت کرتا ہے۔ بیت خان رہ سکتا ہے جو اول درجے کا سودا خور ہے۔ ڈاکٹر ادریس رہ سکتا ہے جو ہے تو کسی سرکاری خیراتی ہسپتال کا معمولی کپاؤنڈر مگر دھڑلے سے خود کوڈاکٹر کمائاتے ہوئے لیکن کھول کر بینجا ہے اور جس کی نیبل پر ایک ٹرے میں پلے سے تار شدہ پریاں رکھی ہوئی ہیں۔ ہر ڈی میں ایک ایک پین ٹلر، ایک شند کی گولی، ایک نزلے زکام اور ایک بخار کی گولی اور ایک ٹلے خراب کا یہ پیول رکھا ہوتا ہے۔ سب مریضوں کے منہ میں ایک ہی نہرا میٹر ٹھونے کے بعد وہ سب کو مساوات کی بنیاد پر یہی زیماں تقسیم کرتا ہے۔ کوئی زیادہ جھجٹ کرے تو ٹکوڑ کا ٹھجکشن اسی سرخ سے گھونپ دیتا ہے جو چاروں سے مختلف بازوؤں میں چھبوٹی جا چکی ہے۔ یہ سوت کا سودا اگر اور بیماریوں کا بیماری یہاں رہ کے مسحا گھلا سکتا ہے، صرف یہ بھڑے نہیں رہ سکتے۔“

میں نے یہ سب صرف سوچا، کہنے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ صورت حال کا اصل جائزہ لینے کے لیے میں چاچا کے گھر جا پہنچا۔

خلاف معمول آج چاچے کی چارپائی دروازے کے آگے نہیں بچھی ہی، نہ ایک کواڑ کھلا تھا۔ پہلی بار مجھے دروازہ کھنکھانا پڑا۔

”ہاں بھی.....“  
”چاچا..... گھر ہی ہو؟“

”ہمیں، گھر سے نکلا ہوا ہوں۔“ اکتائے لجے میں جواب ملا اور اگلے ہی لمحے دروازہ کھول کے چاچا میرے سامنے تھا۔

وہی پرانی ٹکلی چھلکائی ہوئی بیان جس کا رنگ کبھی سفید ہو نا ہو گا، اب تو میالا سا سرگی ہے اور جس میں ان گست پھید ہیں۔ وہی ڈبوں والا تمد جس میں سے بدبو کے سخت زور اور قسم کے بھجکے اٹھتے تھے اور جس پر ہر قسم کے نشانات موجود تھے۔ چائے، ٹیل اور پان سے لے کر مرغیوں کی خلاقت تک کے۔ وہی ہفتوں سے بے دھلا منہ... وہی پیلے دانت اور جامنی مسوڑ ہے.... وہی مریلی شکل پر خار کی طرح اگے سخت اور کھیدرے سفید بال جونہ صاف ہوتے تھے نہ داڑھی بڑھتی تھی۔ وہی ناخنوں میں بھری میل اور وہی بھٹی ایڑیاں۔

چاچا کو بہتر حلیے میں، میں نے تبدیل کیا تھا، جب میں

کمرے میں گھس گئی۔

”اچھی رونق لگالی ہے چاچا!“

”او بس..... رونق کیا لگائی۔“ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

اتنے میں دروازہ ایک بار پھر زور سے بختے لگا۔

”یہ کون ہے نامائیم۔“ وہ اپنی بوسیدہ چل گھٹتے ہوئے اٹھا۔ میں آرام سے بیٹھا خرگوش کو مٹی کھوتے دیکھا رہا کیونکہ میں جانتا تھا، آنے والے کون ہو سکتے ہیں۔

”کیوں بھی چاچا بیہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟“

اس گروہ کی لیڈری کر رہے تھے بھا حنیف، لہذا سب سے پلا سوال انہوں نے ہی اٹھایا۔

”تماشا تو تسویہ سارے لگا رہے ہو میرے دروازے کے آگے کھڑے ہو گرہنے کوئی سنیا ہے جس کے نکت مفت میں بٹ رہے ہیں جو تم سارے کے سارے بغیر لین بنائے جمع ہو۔ چلو جاؤ تکام کرو اپنا۔“

چاچے نے رکھائی سے جواب دے کر دروازہ بند کرنا چاہا مگر لوگوں نے دندناتے ہوئے آگے گھس کر یہ کوشش ناکام بنا دی۔

”چاچا کس کی اجازت سے تم نے محلے میں خروں کی ٹیک گھسائی ہے؟“

”اچھا.... مجھے نہیں پتہ تھا کہ اس کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔“ چاچے نے بھولین سے منہ لٹکا کے کما اور ایسا کرتے ہوئے اس کی صورت پلے سے کہیں زیادہ مکار محسوس ہوئی۔

”اس سے پہلے تو بغیر اجازت کے ہن انہیں آتے دیکھا ہے۔“

”بات کو گھماو نہیں چاچا! انہیں ابھی، اسی وقت نکال باہر کرو۔ ہم ایک منٹ بھی انہیں یہاں برداشت نہیں کریں گے۔ یہ اس محلے میں بالکل تمیں ٹھہر سکتے۔“

”ہلااا...“ چاچا نے اثبات میں سرہلا یا۔

”پہلے یہ ثابت کرو کہ تم انہیں ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔“

”کیا مطلب؟“ افضل بٹ چونکا۔ یہ دعوا اسی نے کیا تھا۔

”مطلب ایسہ کا کہ ابھی پچھلے دنوں تمہارے ہی گھر میں اکٹھے ہوئے تھے اور مجھے نہیں پا دیا تاکہ تم نے کسی کی اجازت لی تھی۔ تم سب کا اپنا گزارا نہیں، وہ تماں کے بغیر ہر روز کسی نہ کسی لے گھر کے آگے ناچ رہے ہوئے ہیں۔“

یہاں نیا نیا آیا تھا اور چاچے کے مکان میں ایک بیوہ خاتون اپنی بہت سی بیوی کے ساتھ کرائے پر رہتی تھی۔ ان دنوں چاچا دسرے میرے دن منہ بھی دعویٰ تھا۔ بفتے میں ایک بار تالے پر بیٹھنے والی کے آگے اکٹوں بیٹھ کے اُستَرے سے شیو بھی بزا تھا۔ بیان کے اوپر کرتا بھی پستا تھا اور تمہ بھی شوخ رنگوں والے ہوتے تھے مگر یہ بیوہ کرایہ دار نیاں زیادہ دن نک نہ سکیں اور چاچے کو اپنی جون میں آنا ہی پڑا۔

”بڑی درجے سے پنجی ہے تیرے تک خبر۔“ چاچے نے اپنے آدھے بھنخ سرپر خارش کرتے ہوئے طنزًا پوچھا۔

”بتوالاں اتنی آلکسی تو بھی نہیں رہی خبریں پھیلانے میں۔“

”نہیں، ماں کی سروس تو بڑی کوئی ہے۔ میں ہی ذرا دری سے ہاتھ لگا اور سناو چاچا کیا خبریں ہیں؟“

میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے مجس انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔

صحن میں لگی الگنی پر درجنوں رنگ برلنگے کپڑے لرا رہے تھے۔ برآمدے کے اس کونے میں اونچی ہیل والی سینٹلؤں کا ڈھیر لگا تھا۔ اندر کسی کمرے میں لگے نیپ ریکارڈر پر نور جہاں کی شوخ آواز ابھر رہی تھی۔

کیا زبردست ماحول تھا..... کیا افسانوی اور رومانوی سا..... کاش یہ انہی مناظر تک محدود رہتا مگر اس سارے تاثر کا بیڑہ غرق کرنے کے لیے اندر سے کوئی ٹھک ٹھک چلتا باہر آیا۔ سرگھیردار ہوتی شلوار..... پرنٹڈ بڑے سے

ٹھکے والی فٹنگ کی قیص..... اونچا مبالغہ مگر اسانولار ننگ مگر

صرف گردن کی حد تک۔ گردن سے اوپر چھرہ ملکا بزری مائل سفیدی..... مصنوعی کرلز لمبیں سجا کے جوڑا بنا یا کیا تھا۔ ہاتھ میں کٹورا اٹھا رکھا تھا۔

”چاچا! مہندی لگانی ہے، بڑی رانگلی (رنگ والی) ہے۔“ اس نے چاچا ٹیم پاس کو آفر کی اور چاچا کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ میری وجہ سے جھک رہا ہو۔

”اوہ، ہو، پڑھنے آئے ہیں۔ اپنے پڑھنے سے ہی کو دیدار کے ہاتھوں سے اپنے پیروں پر مہندی لگوائے“ ٹھنڈ پڑ جائے گی۔“

”پیروں اپہ ہی کیوں؟“ میں نے بے تکلف ہونا چاہا۔

”تاکہ اور یو گھنٹوں تک ادھر سے اٹھنے کے قابل نہ رہو۔“ دیدار نے بلند تقدیم لگایا اور ملکتی ہوئی دوسرے

سب سے چھوٹے والے سے اپنے شانے دیوار ہاتھا۔



بعد میں ماں نے مجھے بڑی لے دئے کہ جب محلے کے شرفاء چھاپے مارنے چاچے کے گھر گئے تھے تو میں وہاں سے برآمد ہوا تھا۔

"تو میرا رشتہ دار ہے، میرا پرومنا ہے۔ بدناہی تو میری ہی ہوئی۔" انہوں نے طعنہ دیا لیکن جب میری زبانی آگے کی رو سیداد سنی تو چیل پاؤں میں اڑس کے محلے کی عورتوں تک ان کے شوہروں کا یہ نیا کارنامہ پہنچانے چلی گئیں۔

لگ رہا تھا اس بار چاچے کے کرایے، دارالٹک جائیں گے کیونکہ ان کے کافی قدر دران آگ آئے تھے۔ جبکہ چھٹلے کرایہ داروں کے پسا ہو کر بھاگ جانے کی وجہ یہی سمجھی کہ اکیلا چاچا ہی ان کے خرخے اٹھانے والا تھا جیسا کہ چھٹلی بار بھاگنے والی وہ یہودہ خاتون اور ان کی بست ہی یہودہ صاحبزادی۔ صاحبزادی "بست ہی" اس لیے تھیں کہ دوبار یہودہ ہو چکی، تیسری بار چاچا مر گیا (اس کے کاجل بھرے غینوں پر) لیکن قسمت کی ستم ظرفی دیکھیے کہ چاچے پر بست ہی زیادہ یہودہ صاحبزادی کی بجائے نسبتاً کم یہودہ مان مائل بہ التفات نظر آتی سمجھی اور چاچے کا وہ حال کہ ادھر چاؤں یا ادھر۔ تب میں نیا نیا یہاں آیا تھا، اس سے اتنی بے تکلفی نہیں بڑھی تھی کہ کوئی مشورہ دیتا، ورنہ کسی پارتو نیا لگا ہی رہتا۔ محلے والوں کو دو جوان جہاں یہواؤں کا چاچے کے ساتھ اکیلے رہنا کھلتا تھا، اس لیے آئے دن پہنچا یتیں بیٹھتیں۔ ماں چاچے پر دیاؤ ڈالتی کہ دنیا والوں کی زبان بند کرنے کے لیے وہ کوئی قدم اٹھائے، کوئی شرعی قدم جبکہ چاچا اس کی بٹی کی آس پر تھا۔ اتنے میں ماں بٹی کو کوئی اور لے اڑا۔ وہ مقام غالی کر گئیں اور چاچے کا رل بھی۔

اس سے پہلے کا احوال میں کافی لوگوں سے سن چکا ہوں۔ ان یہودہ گرائے دار نیوں سے پہلے کی کرایہ دار نیاں کنوواری گھیں۔ (ماں کو چھوڑ کر) ان تین عمر سیدہ کنواریوں میں سے اختیاب کرنا بھی چاچے کے لیے کافی مشکل ثابت ہوا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں کئی مہینے تک لگا رہا، یہاں تک کہ نیوں ڈھلتی عمر کی کنواریوں نے ادھر ادھر ہاتھ پیرمار کے اپنے اپنے بر تلاش کر لیے۔ یہ گھر ان کے لیے خاصا بھاگوں ثابت ہوا تھا جو کام تیس سالوں میں نہ ہو سکا، وہ چھ مہینے میں ہو گیا۔ ادھر ان کی ماں نے بیٹیوں کی منظی کھارے ہو۔"

بھی کسی کا کا کا کی ہونے پی..... کسی کے عقیقہ یا سرمنڈنے پی..... شادی دیا یا منڈنی پی..... بھی بچہ پاس ہونے پی..... تم لوگوں کا تو بس نہیں چلتا مرگ والے کھرپہ بھی دریاں بچھا کے ان کے مجرے کراں لوپھر اب اتنا خار کیوں کھارے ہو۔"

"وہ الگ بات ہے چاچا! خوشی کے موقعہ پہ بندہ رنگ لگا ہی لیتا ہے، کوئی موج میلہ کرنے کے واسطے نیکن ان کو گوانڈی بنا کے سرپہ سوار نہیں کر سکتے۔ ادھر کا ماحول خراب ہو گا۔"

"او چل چل..... کم کر اپنا۔ وہا آیا ماحول سنوارنے والا۔ پہلے اپنے گھر کا ماحول تو تھیک کر۔ میری بھی چوبیس گھنٹے دروازے کے آگے بڑی رہتی ہے۔ محلے کے تر گھر میں کیا ہو رہا ہے، سارا پتہ چلتا رہتا ہے مجھے۔" افضل بٹ اس بلیک میلنگ کے زیر اثر آگیا اور دوبارہ منہ کھونے سے باز رہا۔

"واہ جی واہ..... ساری عمر ہم لوگ دوسروں کے گھر میلے لگاتے رہے، آج ہمارے گھر میلہ لگا ہے۔"

اندر سے کوئی اپنی مخصوص ٹکٹک مشک کے ساتھ برآمد ہوا اور لپ اشک سے تھپے موئے ہونوں پر مندی بھرا ہاتھ رکھ کر ٹھٹھالا گیا۔

"نی بلو... باہر نکل... وڈے وڈے لوگ آئے ہیں بلو سے ملنے..... بھی لین بناؤ سارے..... بنے جانا اے بلو دے گھر، کنے کنے جانا اے باؤ دے گھر۔"

بغیر کسی اٹی میشم کے وہ ناچتا اور نہ سکے لگانا شروع ہو گیا۔ گود میں ڈھونکی انحصارے پچھلے کرے سے رانی مکری بھی برآمد ہوئی۔ یہ ایک پست قامت گول مول سائیجر رہتا جس نے آنکھوں میں نیلے لینس بھی لگا رکھے تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے اپنے دانتوں والی گرے کا لے رنگ کی لمبی تڑپی گی ملکہ سمجھی۔

تینوں نے مل کے رونق لگادی۔ انیں نکلوانے کے لیے مظاہرہ کرنے آئے بھا حنفیف کے وند کے ارکان جیسے رس اور بیس کے نوت نکال نکال کر پنجاہور کرنے لگے۔ اچھی طرح جیسیں جھاڑ کے جب وہ یہاں سے رخصت ہوئے تو یقیناً یہ بات فراموش کر رکھے تھے کہ ان کے یہاں آنے کا مقصد کیا تھا۔

"لے بھی چاچا" تیرا کرایہ تو پہلے دن ہی اکٹھا ہو گیا۔" ان کے گرد نے نوت لگتے ہوئے تقدیرہ لگا کر کہا۔ وہ

”یہ میرے ذمے دیکھو... بھائی کسی قیص میں پورے آتے ہیں۔“

”چل چل.... یہ ذمے اس کو دکھایا کر جس کے لیے تو اور چڑھتا ہے۔“

انہوں نے سامنے والے گھر کی بشری کا ذکر کیا جس کا مزاج بھلے سوانیزے پر رہتا تھا مگر تمام تر چڑھتے ہیں اور جب مزاجی کے باوجود جس کے دانت ہر دقت نگہ رہتے تھے کیونکہ وہ اندر جاہی نہیں سکتے تھے۔

”اس سے پہلے کہ سلمان اپنے دفاع میں یا اس کی دندلو کی حمایت میں کچھ اور کہتا، دروازہ دھڑ دھڑ بجنا شروع ہو گیا۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ فوزیہ کے لیے اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا میں کے زخم سے نکلنے کا وہ ایسے ہی بال بکھرائے بغیر دو پہنچ اور چیل کے باہر بھاگی۔

”لی فوزیہ.... گلے میں تو کچھ ڈال.... ہو رے باہر کون ہو۔“ اس بار انہوں نے اس کے گلے میں کچھ ڈالنے کی فکر کی لیکن باہر اور کوئی نہیں میری بے بے بھی۔

”بے بے....“ حیرت اور خوشی نے بیک وقت مجھ پر حملہ کیا۔ مجھے پورے دو مینے ہو رے تھے گھر کے ہوئے شروع میں، میں ہر ہفتے گھر بھاگتا تھا، پھٹی وہیں گزارتا پھر ایک ہفتہ چھوڑ کے۔ بعد میں دو دو ہفتے گزار کے جانے لگا۔ ایسا نہیں تھا کہ گھر والوں کی یاد نہیں آتی تھی لیکن کام کی نیچکن اتارنے کی بجائے سفر کی مزید تکان خود پر سوار کرنے سے گھبرا نے لگا تھا میں۔ اگلی شام کام پر جاتے ہوئے بجائے تازہ دم ہونے کے میں نڈھاں ہو تاھا اور دوسرا سفر کے خرچے سے بھی گھبرا گیا تھا۔ سستے سفر میں انجر پنجرہل جاتے اور کوچ میں آنے جانے کے کئی سو لگ جاتے۔ وہاں جا کر بے بے بجا کھچا بھی جھاڑ لیتی، بے بے کوشید میری یاد زیادہ ہی ستانے لگی تھی، اسی لیے وہ بغیر اطلاع کے یہاں موجود ہیں۔

میں دوڑ کے ان سے پٹ گیا۔

”بے بے.... بتایا تو ہوتا ہے آنے کا۔ میں اُڑے تک لینے آ جاتا۔ گھر تو آرام سے مل گیا تھا؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”ساح تو لینے دے پڑیں... ہف گئی ہوں میں.... تو سہ اتنا لہا پینڈا۔“ انہوں نے بر قلعے کے بیٹن ایک جھٹکے سے نکولتے ہوئے اسے اتار کر زردی کی چارپائی پہ پہنچنا اور میں کی جانب

کے لڈو چاچا کو بھجوائے، ادھر چاچا نے انہیں مکان خال کرنے کا نوٹس بھجوایا۔ اس نے اپنی تین عدد بیویوں کو زیارت عرصہ نکلنے نہ دیا تھا۔ یہاں تو کسی اور کی ہونے والی بیوی کو کیسے رکھ لیتا، چاہے کرائے پہ آئی۔

”تیرے نام.... ہم نے کیا ہے....“ سلمان نے چھٹ پسے تان لگائی تھی اور چونکہ عین بیویوں کے درمیان میاں فوزیہ کو گھٹنوں میں دیوچے اس کی لیکھیں نکال رہی تھیں، اس لیے ان تک یہ صدا با آسانی پہنچ گئی۔

”آگے بڑے محل جو یہے کھڑے ہیں پیوردار کے جو تو پتہ نہیں کس کے نام لگانے چلا ہے۔ چل پنجے اترے ہے جیا۔.... پہلے ہی رنگ ماننا تھا اب سنگے پنڈے کو بھے پر دھوپ کھا کھانا کے پکا کر لیا ہے۔ سارے سو باتیں کرتے ہیں کہ تیرے منڈے کو ”جھنگا“ (قیص) بھی نصیب نہیں ہوتا۔ مولیٰ پتلون ہے تو وہ سوکھی سڑی ٹانگوں پر کھال کی طرح چڑھی ہوئی۔ تو تو کہیں اٹھتا بیٹھتا ہے تو میری جان انک جاتی ہے کہ لوچی اب پتلون کی سلائی نکلی کہ نکلی.... مگر تو ایسا شرم پہنچو ہے کہ ذرا خیال نہیں۔ بعد میں اس ”وندلو“ (بڑے دانت والی) کے نام لگاتے رہنا جو لگانا ہے، پہلے پنجے اتر کر گلے میں پکھ ڈال۔“

سلمان بڑے بڑے منہ بناتا پنجے اتر۔ اتوار کا دن تھا اور میں خاصا فریش اور فارغ فارغ ہاکا یہاں کا سامنہ محسوس کر رہا تھا خود کو کیونکہ اتوار کی رات کو میری دیوالی آف ہوتی ہے۔

”لاؤ کیا ہے.... کیا کھانا ہے؟“ ”میرا سوپ۔ کھانے پینے کے وقت ہی ماں کے متھے لگنا ہوتا ہے۔“

”خود ہی تو بلا یا تھا کہ پنجے اکر گلے میں کچھ ڈال لو، ورنہ مجھے خاص بھوک نہیں۔“

”میں نے گلے کے اندر نہیں،“ گلے کے اور پکھ ڈالنے کو کہا ہے بے شرم۔ بہنوں کے سامنے نگا بوجا پھر تارہتا ہے۔ یہ حیدر بخت کو دیکھ، کیا شرمیں والا بچہ ہے۔ پورے بازوؤں کی قیص پہنتا ہے۔“

ابھی میں تعریف پر خاص اترابھی نہ سکا تھا کہ سلمان نے طنزیہ دار کیا۔

”میرے ایسے بھنڈی تو ری بازو ہوتے تو میں بھی ایک نہیں دو دو قیصوں میں چھپا کے رکھتا لیکن یہ دیکھو ماں....“ اس نے اپنے مسلز پھٹلاتے ہوئے تخریب کہا۔

”یہ تو بالکل دوسری بتوالاں سے۔“ انہوں نے صورت دیکھ کے اسی رائے قائم کر لی۔ حالانکہ فوزیہ سیرت میں بھی ماں کا پروٹوسمی۔

کوثر کے ماتھے پہنچنے والے شک مل پڑے رہیں۔ بھلے وہ روکھے انداز میں مہمانوں کو سلام کرتی ہو۔ جانے ہے حال چال تک پوچھنے کی توجیہ نہ ہوتی ہوا سے لیکن ایک بات بھی اور وہ یہ کہ وہ مہمانوں کی خاطر مدارت بھی بہت کرتی تھی۔ کھانا نے کا وقت ہو جانے میں خاص وقت نہ تھا۔ ماسی نے پالک کا ذہیر میرپے سامنے کاٹ کر دیا تھا اسے اس لیے بے بے کی آمد سے قبل شاید صرف وہی لکنے کا پروگرام تھا مگر جب کھانا لگا تو پالک گوشت کے علاوہ ماش کی دال اور آلو قیمه بھی دست رخوان پہ موجود تھا۔ بے بے ٹھمریں کمال کی گوشت خور... انہوں نے ڈٹ کے کھانا کھایا مگر حسب عادت ایک لفظ بنانے والی کی تعریف میں نہیں کہا۔

میں ان سے گھر کی وڈے بھاجی کی، اپنی تینوں بہنوں کی باتیں کرنے کے لیے بے تاب تھا مگر وہ کھانی کے وہیں ماسی کے ساتھ ان کی چارپائی پر لیٹ گئیں اور لیکن برا دری بھر کے بخیے ادھیر نے۔ بھی کسی کا خیال آ جاتا، بھی کسی کا دھیان۔ کبھی ماسی کو ڈونگے بونگے کی اپنی کسی سیلی کی یاد آ جاتی اور وہ اس کا احوال دریافت کرنے لگتیں۔

”ہائے... مشتری کی سالس ابھی تک زندہ ہے؟“ وہ جی بھر کے حیران ہو گیں۔

”حیرت والی بات تو یہ ہے کہ ایسی ساس کے اتنے سالوں سے ساتھ ہوتے ہوئے وہ خود کیے زندہ ہے۔ ساس تو ٹھمری ڈھیٹ ہڈی، تیراپانی مر رہا ہے تو تو خود مر جا۔“

”ایکے ہائے میں کیوں مریں؟“ ماسی بد کیں۔

”تجھے نہیں، اس مشتری کو کہہ رہی ہوں۔“ بے بے کو غائبانہ مشورے دینے کی عادت تھی۔

”اور ہاں بتوالاں! وہ تیرے دار کوں کا کوئی رشتے دار، وہ تیرے دور کا چاچا بھی تو یہیں رہتا تھا، تیرے گھر کے پاس۔ وہی مر در در جو روز نانیاں بھڑکا پچاہے۔“

”وہ پرانی بات ہے، اب تو تیری بھگتاے بھی چھ سال ہو رہے ہیں۔ یہیں رہتا ہے چاچا! یہ دیوار سے دیوار ملی ہے۔“

”میں مرحاوں نی۔“ بے بے ہاتھ لٹکی اٹھ بیٹھیں۔ ”تین تین؟ اور ایک بھی نہ بس سکی۔ لکنے لندوڑے مرحانتے ہیں اور ایک جور دبھی نصیب نہیں ہوتی۔ ادھریں

متوجہ ہو گئیں جو دنوں بازو پھیلائے اپنا بھماری بھر کم ڈیل ڈول سنجا تھیں خپر مقدی انداز میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ فوزیہ نے جان بخشی ہوتے دیکھ کر اپنے کھلے بال فناٹ سینئنا شروع کر دیے تھے۔ کوثر بھی مجس انداز میں صحن میں جھانک رہی تھی۔

”ست بسم اللہ... جی آیاں نوں.... میری بس آئی ہے، جاوے سلماناں... بھاگ کے اپنے پیوکی دکان سے ٹھنڈی بوتل پکوک کے لا۔ ساتھ اسے بتا کے آکے ڈونگے بونگے سے بس رہماں آئی ہے۔“

”رہما؟“ اپنے مسلز کو ستائش سے سلا تا ہوا سلمان ایک دم چونک گیا۔

”واہ خالہ.... آئی تو ڈونگے بونگے سے ہو، پر نام بونگا نہیں ہے۔ رہما..... داہم... کس نے رکھا تھا یہ مادرن نام۔“

”میری بے بے کا نام رہما نہیں، رحیمہ ہے۔“ میں باقاعدہ برآ مان گیا، اس لیے وضاحت پیش کی کیونکہ بے بے تو کسی بھی فرم کی وضاحت پیش کرنے کی بجائے پورا منہ کھولے اس کو تک رہی تھیں۔

”ہا... ہائے... بتوالاں.... ایسے کی اسے...؟“

”میرا پتر سلمان۔“ ماسی نے شرم مندہ شرم مندہ سا اعتراف کیا۔

”اچھا اچھا، اکھاڑے جا رہا ہو گا؟“ بے بے نے اس کا ڈیل ڈیکھ کے اندازہ لگایا۔ ”رنگل کا شوق ہے منڈے کو... اچھی بات ہے۔“

”رنگل ورنگل نہیں خالہ، باڑی شاڑی بنانے کا شوق ہے اور میں کسی اکھاڑے میں نہیں جنم جاتا ہوں۔“

”پسلے دہاں جا جہاں میں نے کہا ہے۔“ ماسی نے گھور کے اسے بھگایا۔ انہیں ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ دوسرے سلمان کے جوابے سے ان کا مذاق نہ اڑا میں۔

کوثر پر دین سام کرنے آئی تو ماسی نے تعارف کا مرحلہ بھی نہیں کیا۔

”یہ میری دڑی ہے، کوثرے.... تو نے جس دیکھا تھا بڑی چھوٹی بھی۔“

”دنیں خیرا تھیں چھوٹی تو نہیں تھی۔ مجھے تو اب بھی لسی ہی لگ رہی ہے۔“ بے بے نے خاص رغبت سے اسے نہ دیکھا۔ دیکھے بھی وہ ایسی چیز نہ تھی۔ ماتھے پہ تین چار مولے موٹے ملے مارے باندھے کھڑی تھی۔

”اور یہ نکی، فوزیہ... اپنے پیوکی لاؤ، فوجیہ رانی۔“

اپنے مخصوص اکھڑانداز میں جواب دے کر وہ باہر چاہکی تھی۔

”آئی تو میں واقعی تم سے ملنے تھی لیکن پھر میں نے سوچا۔ آئی ہوں تو اور کام بھی نہیں۔“  
وہ سوچ انداز میں آنکھیں سکوڑے ہوئے تھیں۔  
”تعینی خاندان بھر کے سفارتی دورے اور پر تکلف کھانے۔ چائے اور ناشتے۔“ میں نے بُٹن بند کرتے ہوئے گلہ کیا۔

”نہیں جھلیا، ایک کام اور ہے۔ اچھا یہ بتا یہ سارے تیرے ساتھ اچھے تو ہیں؟“

”کتنی بار بتایا ہے بے بے! ماں وغیرہ سب بہت اچھے ہیں۔ بالکل گھروالا آرام اور اپنا پن ہے، اسی لیے تو سات آٹھ مینے سے نکا ہوا ہوں، درنہ اب تک جاچکا ہوتا۔“

”اور یہ کڑی.... دیے تو کوڑے مزاج کی لگتی ہے۔“  
ان کا اشارہ کوثر کی طرف تھا۔

”عادت ہے اس کی۔ دیے اچھے دل کی ہے۔“ شاید پہلی بار میں نے اس کی خوبی کھلے دل سے کسی کے آگے بیان کی تھی۔

”مختی بھی ہے۔“ مجھے اس کی گھر کے کام اور پھر وقت نکال کر ٹوشن پڑھانے کا بھی خیال آیا۔

”اسی لیے تو... حالانکہ شکل و صورت ایویں سی ہے۔ اور سے ڈانگ کی ڈانگ، پرساد ہے ہاتھ میں۔ پڑھی لکھی بھی ہے۔“ وہ بڑا ہٹ کے سے انداز میں پچھے لکھتی رہیں۔ میرے پاس رہیاں دینے کا وقت نہیں تھا، جلدی سے جوتے پہنے اور بیال بنانے لگا۔

”وے صحیح تجھ بتا پھر کڑی نہیں اے نال؟“  
”ہاں بھی... اور ٹھیک کیا ہوتا ہے۔“ میں ان کی فکر مندی سے جھنچلا گیا۔ بیٹھے بٹھائے کوثر کے بارے میں مشکوک ہو چکی تھیں۔ اس وقت تو میں چلا گیا، اگلے دن واپسی پڑے۔ بلکہ واپسی پہ بھی نہیں، واپسی کے خاصی دری بعد... لوپر کے قریب جب میں سو کر اٹھا، تب یہ انکشاف ہوا کہ اس ساری تفتیش کا مقصد کیا تھا۔

ماں کا چہرہ کھلا ہوا تھا، مار حست بھی خلاف معمول گھربپڑا تھا۔ سلمان کے چہرے پہ آج میرے لیے حدود رقابت کی بجائے ایک زبردستی کا احترام سجا تھا۔ کوثر غائب تھی اور فوزیہ کسی راز کو اگلے کے لیے بری طرح پھر پھر اڑا رہی تھی۔  
بے بے ان سب کے درمیان مہمانِ خصوصی بنی بیٹھیں

تاقد ری وجہ کیا تھی؟“

”کہتا تھا اولاد نہیں ہوتی۔“

”لے یہ تین کی تین ہی اسے بخرا بجھ میں؟ میں تو کہتی ہوں، اسی میں ہی عیب ہو گا، درنہ تین میں سے کوئی ایک تو تک جاتی۔“ بے بے کالمجہ سرگوشیاں ہوا۔  
”نہ اولاد نہ یوی..... کہا کیا ہے؟ اس کی تو چنگی بھلی زمیں جائیداد تھی۔“

”زمیں اب کدر ہرہی ہاں یہ مکان اور پچھلی گلی میں دو ٹنگی کوٹھریاں ہیں۔ وہ چھڑوں کو کرانے پہ چڑھادی ہیں اور اس مکان میں جس میں رہتا ہے، خرے لاگھائے ہیں۔“

اس اطلاع پر بے بے پھر کپھر ک گئیں۔

”واہ ہی، خرے.... اللہ ملائی جوڑی۔“  
مجھے رات تک ان سے اکلے میں بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ نوبجے ہی سوتی پڑ گئیں۔ میں رت جگکے کا عادی، ہفتے کی یہ اکسلی رات بچھی جاگ کر گزارتا تھا۔ کچھ کمیں پوچھنے کے نزدیک سویا تو حسب معمول گیارہ بجے آنکھ کھلی۔ بے بے ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کے ماں کے ساتھ لاہور میں رہنے والے رشتے داروں سے میل ملاپ کرنے روانہ ہو چکی تھیں۔ شام ڈھلنے ان کی واپسی ہوئی تو میں فیکٹری جانے کے لیے تقریباً ”تیار تھا۔ ان کے چہرے پہلی سرشاری دیکھ کے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ ہر جگہ سے اسیں ”چنگا چوکھا“ کہانے کو ملا ہے۔

”میں آئی ہوں تو تو نکل رہا ہے۔“

”میرا تو یہی وقت ہے نکلنے کا۔ اگر آپ واقعی مجھے سے ملنے آئی ہیں تو آپ کو میرے لیے گھر بہ رکنا چاہیے۔ پھر بھی شکریہ۔“

بے بے سے خفگی جاتے جاتے میں نے کوثر کے ہاتھ سے وہ شرٹ لی جو وہ استری کر کے لائی تھی۔ میں ایسے کاموں میں اسے تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ ہفتے بعد کپڑے دھوئی کو دھلنے دے آتا اور استری خود کر لیتا۔ آج اس سے استری مانگنے کیا تو وہ خود کپڑوں کا دھیر سامنے رکھے استری کر رہی تھی۔ مجھے بعد میں آنے کو کہا اور اب خود شرٹ پر میں کر کے لادی۔

”تکلیف کی کون سی بات ہے؟“ ایک شرٹ ہی تو ہے جہاں اتنا ٹھہر کیا، ہاں یہ کرتے میرے ہاتھ نوٹے تھے کیا۔“

گا۔ میں دو مجیس (گائیں) کٹوا کے دیکھیں پکاؤں گی۔“  
(میری شادی کے لیے ان کے ارمان یہیں تک محمدور  
تھے۔)

اس ذکر پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے ان کے  
سینے سے سرا اٹھا کے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”ابھی تو صرف بات بکار کی ہے تیری اور کوثر کی۔ زیادہ  
شوشا نہیں کرنی ہم نے تسلی کی۔ لوگ سڑک کے سواہ  
ہو جائیں گے اور بد مرگی ہوگی۔ سارے چاؤ ایک ہی دفعہ  
دیا ہے نکالیں گے۔“

ساری بات کھلی کے سامنے آئی تو میرا تو عمل عجیب  
تھا۔ نہ مجھے خوشی ہوئی، نہ دکھ نہ افسوس۔ ہاں حیرت ضرور  
ہوئی کہ بے کے دل میں یہ خیال کیون کر آیا جبکہ میری  
تین تین بہنیں کنواری بیٹھی تھیں۔ اس وقت میں چپ  
رہا، رات کو زرا تنہائی ملتے ہی ان سے پوچھا۔

”یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا سو جھی؟ یا آپ آئی ہی اسی  
مقصد کے حکت تھیں۔“

”چج بتاؤں، میں آئی تو صرف تجھ سے ملنے تھی۔ میں مگر  
ادھر آکے اور بتاؤں کو جان پر کھکے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ  
اس کی لڑکی کو اپنے گھر لانا ہمارے لیے اچھا ہے گا۔“

”وہ کیسے؟“

”ذکر نہ تیرے بھائی کی شادی میں نے ماڑے (غیریب)  
بندوں میں کردی۔ کیا فیدہ ہوا...؟ نہ جیزرنہ گھنا نہ پچھ۔  
بتاؤں نے دونوں لڑکیوں کے لیے بڑا کچھ جوڑ رکھا ہے۔  
اندر لو ہے کی پیٹی اور تک کمبلوں و رضاۓ یوں سے بھری  
ہے۔ برتن طرح طرح کے ہیں کہ کیا بتاؤں۔ زیور بھی بنایا  
ہوا ہے۔“

”بے بے.....“ مجھے خاصی کوفت ہوئی۔ ”اب صرف  
ان کمبلوں، رضاۓ یوں کو اوڑھنے یا برسنے میں کھانا کھانے  
کے چاؤ میں، میں کسی سے بھی شادی کرلوں۔ کل کو آپ کو  
کسی اور کامبل پسند آگیا تو کیا اس سے شادی کرنی پڑے  
گی۔ جس کا جیزرنہ ہے اس کے کام آئے گا، آپ کو اور مجھ کو  
کیا فائدہ۔ آنے والی کے زیور میں نے یا آپ نے تو پس  
کے نہیں بیٹھ جانے۔“

”لا ہور آکے بھی تو وہی کم عقل کا کم عقل رہا۔ تیرے یا  
میرے نہیں تو تیری بہنوں کے کام تو آسکتا ہے۔ کیا ہوا جو  
بھائی اپنے چار سونے کے سیٹوں میں سے ایک ایک  
بندوں کو دے دے۔ دو کمبل رضاۓ یاں ایک ایک

سامنے لڈوں کا ذہب لیے ہوئے تھیں۔ میں آگے بیٹھا تو

جمت ایک لڈو میرے منہ میں ٹھوںس دیا۔

”چل سلام کراپنی ماسی اور ماے کو۔“ نیا حکم ملا۔

میں نے اندر آتے ہی سلام کیا تھا۔

”وہ والا سلام نہیں۔ آگے ہو، سرجھکا۔ ہاتھ ماتھے تک  
لے جا کر سلام کرا در پیار لے ان کا۔“

اس ہدایت پر میں نہنہ ک گیا اگر صاف انکار کرنا  
گستاخی اور بد تیزی محسوس ہوا۔

”چل نا۔“ بے بے نے باقاعدہ دھکاریا۔ میں لڑکھڑا کے  
سنپھلا اور ذرا جھوکتئے ہوئے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔

میرا خیال تھا، شاید بے بے ان کی احسان مندی سے  
مغلوب ہو کے مجھے ایسی فرماں برداری اور برخورداری  
جھاڑنے کے لیے کہہ رہی ہیں۔ جیسے ہی سلام کر کے میں  
نے سرجھکایا، مامانے خوب دیا کے سربیہ ہاتھ پھیرا اور ماسی  
نے چنایت میرا ماتھا چومنا شروع کر دیا۔ وہ دعا میں دینے  
لگے اور فوزیہ کمال بے تکلفی سے اگر میرے شانے پر  
جھوول گئی۔ میں اس مظاہرے پر سپنا گیا۔

”مبارکاں بھئی مبارکاں.....“ اب ایک دسرے کے  
منہ میں لڈو ٹھونے جانے لگے۔

”آج سے حیر آپ لوگوں کا بیٹا۔“ بے بے کی اس  
کھلی ڈلی آفرپہ میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ ٹھیک تھا کہ میں  
محوراً یہاں ان کے گھر رہ رہا تھا، ان کا رویہ بھی میرے  
ساتھ محبت بھرا تھا اور میرا بھی دل خوب لگ گیا تھا لیکن  
اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بے بے مجھ سے خوشی خوشی  
رست بردار ہو کے مجھے ان لوگوں کو سونپ دے۔ ماسی اپنے  
اکلوتے سپوت سے بے زار اور نالاں ضرور تھی، لیکن مجھے  
یہ امید نہیں تھی کہ وہ مجھے گود لینے کا فیصلہ کر لیں گی۔

”اور ہماری کونشرپریں آپ کی۔“ ماسی کے الگ  
فقرے سے اور بھی چونکا۔ یعنی اول بدل۔ بے بے کو اس  
کے ہاتھ کے پکے کھانے اس قدر بھاگئے کہ انہوں نے  
میرے بدلے یہ سودا کر لیا۔ میرا دل بیٹھنے لگا اپنی بے  
وقعتی یہ۔ قریب تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کے رو پڑتا،  
فوزیہ چلا آئھی۔

”ہائے اللہ، خوشی کے مارے بھائی جان کے آنسو نکل  
آئے۔“

”پاغلا، یہ رونے کا کون سا موقع ہے۔“ بے بے نے  
میرا سرینے سے لگایا۔ ”خیر سے میرا پتر لازھا (دولما) بنے

البھن محسوس ہونے لگی تھی۔

ای بے چینی اور البھن کے خاتمے کے لیے میں نے کوثر پر دین کے لیے آمادگی طاہر کر دی۔ وہ کوثر پر دین جس کے ساتھ ایک ہی گھر میں پچھلے سات آٹھ مہینے سے رہتے ہوئے یہ خیال ایک بار سرسری سا بھی میرے ذہن کو چھوکر نہیں گزرا تھا۔



فیکٹری سے واپس آتے ہی میں نے بے چینی کو دیکھنے میں بھڑا دیا تھا۔ وہ بڑی خوش خوش لوٹ رہی تھیں۔ ماں نے انہیں ایک لان چکن کا سوت اور ایک شیفون کا گرتا دوپٹہ تھفتا "دیا تھا، ساتھ میں مٹھائی کا پورا توکرا۔

روز ناشتہ کوثر پر دین کے ہاتھ سے ٹھا جاتا تھا۔ آج ماں نے بڑے ڈلار سے میرے سامنے رکھا۔ میں کوثر کے بارے میں پوچھتا ہی رہ گیا۔ بست دل چاہ رہا تھا اس نے رشتے میں بندھنے کے بعد اس کو دیکھنے کو تاکہ اندازہ کر سکوں اس کے تاثرات کیا ہیں مگر وہ بھی کہ خجائے کہاں خندق کھود کے بیٹھی تھی، نظر ہی نہیں آتی تھی۔

"مسمناں پلے گئے بہن؟" دیوار پار سے باجی ساجدہ کا سر نمودار ہوا۔

"خیر تو ہے، بڑی مٹھائیاں لے کر رخصت ہوئی ہیں تمہاری یہ رشتہ دار؟ کیا بات ہے؟" انہوں نے ٹوہ لینا چاہی اور میں نے ناشتے کے لیے جھگا سر پکھ اور بھی جھگا دیا۔ میری اور کوثر کی منگنی کی خبر سننے کے بعد وہ کسی بھی قسم کا بے لال تبصرہ کر سکتی تھیں مگر مجھے ماں کے جواب پر حیرت ہوئی۔ وہ باجی ساجدہ کو ٹھال رہی تھیں۔

"بات کیا ہوئی ہے ساجدہ! ایسے ہی میری یہ بہن مٹھائی کی شو قین ہے اور لاہور کی مٹھائیوں کی توبات ہی اور ہوئی ہے، اس لیے میں نے تو کرا ساتھ کر دیا۔ دیے بھی میری برادری کے بہترے لوگ ادھر ڈونگے بونگہ میں رہتے ہیں۔ ساروں کو بھجوانے کے لیے دی ہے۔"

"گئی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ آخر رشتہ داروں میں مٹھائی کی خوشی کے موقع پر ہی بانٹی جاتی ہے۔" وہ بھی آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھیں۔

"مٹھائی مفت میں کھانے کو مل جائے، اس سے اچھا خوشی کا موقع اور کون سا ہو سکتا ہے۔" میں سمجھہ گیا تھا کہ ماں ان سے میرا رہ اور اپنی بیٹی بکرا رشتے کے طے ہو جانے

ڈنر سیٹ اور واٹر سیٹ دے دے۔ پانچ پانچ عمدہ جوڑے انسیں چڑھا دے۔ کوئی فرق پڑتا ہے؟ آخر شوہر کی ذمہ داری، بیوی کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے۔ کل نہ سی، پرسوں تیری شادی کرنی تو ہے۔ کیوں نہ ایسی عورت آئے جو تیرابو جھے بانٹے۔ پڑھی لکھی بھی ہے اور تیز بھی۔ ہزار دو ہزار کمانے کے قابل تو یہ خود ہے۔ کم از کم اپنا خرچہ انھا سکتی ہے۔ ہم پہ بے شک خرچ نہ کرے اپنی کمالی اور بتولان کا لڑکا۔ وہ موئی عقل والا یہ۔ وہ کسی جو گا نہیں۔

ہو سکتا ہے رحمت کی دکان بھی مجھے ہی سنبھالنی پڑے۔ مکان اور زمینوں میں بھی حصہ سے کوثر کا۔ یہ اچھا کام کیا بتولان نے جو چھ سات پچھے پیدا کر کے کل کل نہیں ڈالی۔

خین ہانوں میں آرام سے حصہ بٹ جائے گا۔

"مگر بے بے..." بے بے کی سوچ سے مجھے حقیقتاً

رچھ کا تھا۔

"اگر مگر رہنے دے۔ پتہ ہے ایک ہاکا سا سونے کا سیٹ بنانے میں بھے کتنے سال لگیں گے۔"

"ہاں ایک سال کی ساری شخواہ اکٹھی کروں تو شاید..."

میں نے دل ہی دل میں حساب لگانا چاہا۔

"اور پورے سال تک ہم لوگ کیا کریں گے؟ ہوا پھا نکیں گے؟ خترے نہ کر... میں نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ زیادہ سو ہنی یا ہولی (بلکی عمر) لڑکی لاسکے وخت نہیں ڈالنا۔ اسے تو اپنی گھنٹی اور سرفی پوڈر کی فلکر پڑی رہا کرے گی۔ کوثر سیاںی ہے اور گھر گھر ہستی مزاج والی... گزار اکر لے گی۔"

میں نے خاموشی سے سرچھ کا لیا۔

میری خاموشی میں کسی قسم کی مجبوری یا سمجھوئی نہیں تھا۔ یہ سچ تھا کہ میری ہمت واقعی جواب دے چلی تھی۔ ہے تو گمینہ ساقچ... مگر سچ بہر حال سچ ہوتا ہے۔ کسی قسم کا اضافی خرچہ نہ کرنے اور ہر بار اپنادل مار لینے کے باوجود بھی جب میں کوئی قابل ذکر بچت نہ کر پایا تو میرے حوصلے نوٹے لگے تھے۔ زبانے کا جو چلن ہو گیا تھا اور جس طرح سفید پوش متوسط طبقے میں بھی غیر ضروری رسومات اور نمود و نمائش کی جو روشن تھی، اس کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا مجھے اپنی کسی ایک بہن کو بھی باعذت طریقے سے رخصت کرنے کا خواب ترک کر دینا چاہیے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ بے بے کی باتوں نے مجھے قاتل نہیں کیا تھا۔ النا مجھے ایک بے چینی نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ مجھے اپنے ہونے پر، ہی

پہلے ہی سوہرنے کے گھر رہ رہا ہے۔“  
میرا جوہ سخ ہو گیا۔ ماسی گھبرا کے میرے سر پر ہاتھ  
چھیرنے لگیں۔

”صدقے جاؤں.... پریشان نہ ہو بلکہ تھے اس پریشانی  
سے بچانے کے لئے ہی تو ایسا کیا ہے ماکہ مجھے کسی کسی کچھ  
لئے کی بات نہ سنبھال سکتے، ورنہ کوئی کے لیے تیرے  
جیسا دلوہا ملنے کی خبر پہ تو میں سارے محلے میں لذوا بانٹتی۔  
اب تو خرے بھی ہمارے ہمایہ ہو گئے ہیں۔ ایک آواز  
دینی تھی میں نے اور ان کو بلوہ کے ناج کروانا تھا لیکن خوشی  
منانے سے زیادہ ضروری عزت سنپھاننا ہے۔“

”میں کوشش کروں گا کہ مجھے جلد از جلد کرانے کا گھر  
مل جائے۔“

معاملے کی سلیمانی مجھے واضح ہو گئی تھی، اس لیے میں  
نے خاصی سمجھدی کی سے کہا۔

”خوانخواہ۔“ وہ برآمد گئیں۔ ”بڑے پیے ہیں ناتیرے  
پاس جو کرانے میں دینے ہیں۔ چپ کر کے بیخارہ..... یہ گھر  
تیرا ہے۔ آج بھی اور آگے بھی جب وقت آئے گا، چپ  
کر کے تاریخ پکی کر لیں گے، تب ہفتے دو ہفتے کے لیے تینیں  
اور تمہارا بندوبست کر دیں گے۔ پہلے سے رو لاڑانے کا  
کوئی فائدہ نہیں۔“

انھوں نے محبت بھری زبردستی سے بات ختم کر دی۔



محبت تو یہ سب بھلے بھی کم نہیں کرتے تھے۔ خصوصاً  
ماسی اور مامار حمت لیکن اب یہ محبت دُلتی ہو گئی تھی۔ بات  
اگر صرف محبت تک محدود رہتی تو تھیک تھا لیکن اب اس  
محبت میں خاصی حد تک تکلف بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ میرا  
اتنا خیال رکھتے کہ میں نے پہلی بار خود کو مہمان تصور کرنا  
شروع کر دیا۔ سلمان گوکتناہی منہ پچھت اور بد لحاظ تھا مگر میرا  
لحاظ کر جاتا تھا۔ کبھی میرے ساتھ فضول گوئی کرنے کی  
نوت نہیں آئی تھی اور اب..... اب تو وہ اتنا احترام کر رہا کہ  
اس میں مصنوعی بن جھلکنے لگتا۔ لاپروا اور کندزاں سی فوزیہ  
کو میری پرو اکٹھی رہنے لگی۔

”بھائی جان! اچاۓ پیس گے؟“

”بھائی جان! اگر می تو نہیں لگ رہی...؟ شرست...؟“  
میں یہ بڑے بہنوئی والا اسٹیشن پاکے جلد ہی گھرا کیا۔  
مجھے ماسی کے بگڑتے بجھت کی بھی فکر ہونے لگی۔ اب روز

کی خبر کو چھپانا چاہتی ہیں۔ کیوں...؟ یہ تو مجھے نہیں پتا تھا  
پھر بھی میں نے ان کی مشکل کم کرنا چاہی۔ پتہ نہیں ان کی  
تلی ہوئی یا نہیں۔ البتہ برے برے منہ بناتی ہوئی وہ دیوار  
سے ہٹ ضرور گئیں۔

میں نے آخری رقمہ منہ میں رکھتے ہوئے ماسی کی جانب  
دیکھا تو وہ نظر میں چاراہی تھیں۔ اگرچہ مجھے یہ برا ضرور لگا  
تھا کہ ایک نیارتہ قائم ہو جانے کے بعد بھی انہوں نے  
اے چھپانا چاہا۔ کیا مجھے بطور داماد کے وہ پسند نہیں کرتیں یا  
میں ان کے معیار کے مطابق نہیں ہوں جو میرا العارف  
بطور اپنے ہونے والے داماد کے کرواتے ہوئے انہیں شرم  
آرہی ہے پھر بھی میں نے کوئی سوال کرنا مناسب نہ جانا اور  
چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

ماسی نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے قریب میٹھنے کا اشارہ کیا اور  
میرے کچھ زیادہ نزدیک گھسک آئیں۔

”بیٹا! برانہ مانا“ میں نے محلے میں یہ خبر کی وجہ سے  
نہیں بتائی اور ابھی فی الحال بتانی بھی نہیں ہے۔ تمہیں اس  
لیے کہہ رہی ہوں کہ کیسی تمباہر کی یاری میں کوتانہ رینا۔“  
ان کا لمحہ سیر گوشیانہ تھا لیکن جب میں بولا تو غصے کی وجہ  
سے آواز ملند تھی۔

”کیوں...؟ ایسی کون سی معیوب بات ہے یہ؟ اور اگر اتنا  
برالگ رہا ہے تو آپ اس رشتے پر راضی ہی کیوں  
ہوئیں؟“

میرے بلند لمحے پر وہ گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے اور ہاتھوں  
کے اشاروں سے مجھے چپ کرانے کی کوشش کرنے  
لگیں۔

”ہوئی.... ہوئی (آہستہ) یہ ساجدہ خود اندر چلی بھی جائے  
تو کان دیوار کے ساتھ ہی لگا جاتی ہے۔“ وہ دیوار کو کھا جانے  
والی نظروں سے گھورنے لگیں جیسے باجی ساجدہ دیوار ہی تو  
ہوں۔

”مجبوڑی ہے پتو... تو تو سمجھ دار ہے، خود سوچ۔ یہ  
غیریب مگر شریف لوگوں کا محلہ ہے اور آج کے زمانے میں  
سب سے نازک چیز شرافت ہی تو ہے۔ شریف بندے کو ہی  
ہر طرف سے خطرہ ہوتا ہے۔ عزت ہی ہر وقت نشانے پر  
رہتی ہے۔ اگر میں نے کوئی تیری ملکنی کی بات پھیلا  
دی تو سارے تیرے اس گھر میں رہنے پر اعتراض کریں  
گے، سو سو باتیں بننے میں گے کہ لڑکی لڑکا شادی سے پہا، ایسے  
ہی گھر میں رہ رہے ہیں یا یہ کہ ہونے والا جوئی شادی سے

علاوہ میوزک سسٹم تو کمال کا ارجمند کیا گیا تھا۔ میں بھا خنیف کے ساتھ دن کو دہلی انتظام کا جائزہ لینے گیا تو دنگ رہ گیا۔

”اتنی کریاں، لگتا ہے کافی تعداد میں لوگ آرہے ہیں وہاں سے؟“

”ہاں تین سو کے قریب ہیں، اتنے ہی ادھر سے ہو جائیں گے۔ ابھی تو تم کل کا دھوم دھڑکا دیکھنا، کل ہمارے ہاں سے مہندی جائے گی اور پانچ سو لوگ ہوں۔ گے۔ لڑکی والوں نے ہاں بک کرایا ہے اور صرف اور صرف باری کیوں کا انتظام ہے۔ تجھ کتاب، چکن تکہ، چانپ تکہ اور کٹاکٹ۔“

”اتنا خرچا کروانے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے دنبے الفاظ میں کہنا چاہا۔

”کوئی ہم نے اپنے منہ سے کہا ہے؟ وہ اپنی خوشی سے کر رہے ہیں۔ بارات کا کھانا بھی ہوٹل میں دے رہے ہیں، جہاں فی کس خرچہ پانچ سورپے ہے۔ دراصل ہم پر رعب و النا چاہ رہے ہیں لیکن ہم کوئی کسی سے کم ہیں۔ ایسا ہیسمہ ہو گا کہ ان کی مہندی اور بارات کا کھانا بھلا دین گے لوگ۔ میرا ایک بہنوئی خود ان پکڑتے ہے، اس کی بدولت ایک اچھے ہوٹل میں تقریباً ”مفت“ سارا انتظام ہو جائے گا۔“ وہ فخریہ اپنے ہی جیسے کسی بہنوئی کا تذکرہ کر رہے تھے اور میں تاسف سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے انہیں اپنے وہ سارے وعظ بھولے ہوئے تھے جو وہ ہم لڑکوں کو اتنا کر کے اکثر ہی دیا کرتے تھے اور اپنی مذہبی علمیت جھاڑ کے متاثر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سرب پٹوپی رکھے اور ہاتھ میں تسبیح پکڑے ہوئے وہ اس وقت اپنے دین کی سب سے پیاری بات یعنی قناعت اور سادگی کو یکسر نظر انداز کیے ہوئے تھے۔

”تو تیار نہیں ہوا۔“ ماسی نے مجھے سلماندی سے پڑا دیکھ کے کہا۔

”ماسی! مجھے کام پر جانا ہے، میں کیسے جاؤں۔ دیے بھی یہ مہندی مالپوں وغیرہ عورتوں کے فنکشن ہیں۔“

”وہ پر الی باتیں ہیں، اب تو منڈے زیادہ تجھ کے جاتے ہیں۔ کام والے کر تے پھر کاتے اور موٹڈے (کانڈے) پر رنگیں دی پئے والے کے۔“

انہوں نے تیکھی نظر دیں سے اپنے برخوردار کو دیکھا جو سلوار اور میرون کام والے کالے کر تے اور سادہ سفید شلوار میں ملبوس گھنٹہ بھر سے آئئے کے آگے جما اپنے پتے

ہی کچھ نہ کچھ خاص پکا کے میرے لیے رکھنے لگیں۔ میٹھا بھی آئے دن بننے لگا۔ مامارحمت روز میرے لیے واپسی پہنچ لیا تھنڈی بول لانے لگے۔ اور تو اور کوثر بھی انتہائی بور اور بد مزہ ہو گئی۔ وہ روز کی جھڑپ، وہ نوک جھونک، وہ بھٹکی میٹھی تکرار خواب ہو گئی تھیں۔ پتہ نہیں کہاں اندر سہمی رہتی تھی وہ۔ سامنا ہو تا بھی تو زمانے بھر کی سنجیدگی چھرے پر طاری کر کے ادھر ادھر ہو جاتی۔ میری تو ہمت نہیں پڑی تھی اسے مخاطب کرنے کی۔ ڈر لگتا کہیں جواب میں پھرنا چنچ مارے۔ مجھے سامنے پا کے اس کے تاثرات کچھ ایسے ہی۔ نگاخ ہو جاتے تھے۔

انی دنوں بھا خنیف کے چھوٹے بھائی کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ گاؤں سے ان کے ماں باپ اور بھائی بین شادی کے لیے یہیں اٹھ آئے۔ لڑکی اس شرکی جو تھی۔ میرا لاہور میں ہونے والی کسی بھی شادی کو دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور عام سے متوسط طبقے میں ہونے والی اس شادی کے ذھوم دھڑکے کو دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کہاں ہمارے ڈونگہ بونگہ میں ہونے والی دن کی شادیاں، مہندی ہوتی تھی لیکن ابھی تک کم از کم ہمارے خاندان میں مردوں اور لڑکوں کا اس رسم میں شرک ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لڑکیاں عورتیں خود ہی جمع ہو کے چار مہندی کے تھال موم بیوں سے سجا کے چلی جاتی تھیں۔ اگلے دن دوپہر کو گلی میں یا چھتیہ قاتمیں دغیرہ لگ جاتیں، پہنگیں دریاں اور کریاں۔ پچھ جاتیں، گرمی کا موسم ہو تا تو اس پاس کے گھروں سے کنکشن لے کر اطراف میں پیڈشل فین لگادیے جاتے۔ بارات کی تواضع دیگ کے سالن، نان اور زردے سے ہو جاتی۔ میٹھے میں فیرنی۔ بت کھاتے پیٹے لوگ ایک آدھ دش کا اضافہ کر دیتے اور بوٹلیں بھی پیلا رہتے مگر یہاں مہندی کے لیے ہونے والی تیاریاں ہی نظر خیرہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔

گلی کے نکڑیہ واقع دستکاری اسکول کا گراونڈ کرائے پیلے رنگ کے شامیا نے لگا کر اندر سبز دریاں بھھائی گئی تھیں، جن پر سرخ اور پیلے غلافوں والے گاؤں تکیے رکھے گئے تھے۔ یہ اہتمام غالباً ”ڈھولک“ بجا کر گانے والی لڑکوں کے لیے تھا۔

مہندی کی رسم ادا کرنے کے لیے اسیج بنایا گیا تھا جس پیلے پھولوں سے سجا پڑھا رکھا تھا۔ پانچ چھ سو تو کریاں دیکھیں بھی کئی قسم کی تیار ہو رہی تھیں۔ اس کے

”ہاں“ کاش میرے پاس کیسہ ہو تا تو میں تمہارے اس روپ کو اس میں محفوظ کر لیتا۔“

تمنکنی کے بعد یہ میرا اس سے پہلا جذباتی و رومانوی مقالہ تھا جو میں نے غیر ارادی طور پر کہہ دالا۔ شاید یہ تمہاری کا اثر تھا یا ہم دونوں کے مابین اس خوبصورت رسمت کی نزاکت کا احساس یا پھر اس کے بدلتے بدلتے روپ اور تیور کافسوں۔

”میں نے کہا“ پتہ نہیں مال سے ناراض ہو کے اور چڑھ رہا ہے۔ چلو میں منالا دوں اپنے بیٹے کو لیکن ناں جی.....“

ماں کی اوپر آواز اور سیڑھیوں سے اترنے کی دھپ دھپ سنائی دی۔ وہ یوں گھبرا لی جیسے چوری کرتی پکڑی گئی ہو۔

”وہ تو اس بے حیا کو دیکھنے بھاگا تھا جو تیار شیار ہونکے اپنا آپ رکھانے کے لیے اور پہلے سے پہنچی ہوئی تھی۔“

ان کی آواز اور نزدیک ہوئی تو میں جھپاک سے اس کمرے میں گھس گیا جو تھا تو سلمان کا مگردن بھر میرے ہی استعمال میں رہتا تھا کیونکہ سارا دن سلمان کو سر کیں نہیں نہیں سے فرستہ نہ تھی اور مجھے آرام کرنے سے۔

”بیڑہ غرق“ تو نے یہ والا جو ڈاکیوں پس لیا نواں نکور۔ یہ تو میں نے تیرے جیزیز میں رکھنے کے لیے بنوایا تھا۔“

کوثر کو اس جامنی جوڑے میں دیکھ کے انہیں دل صدمہ پہنچا۔

”تو کیا پہنچی جو بھی اچھا جوڑا بنے“ پہننا ہی نصیب نہیں ہوتا۔ ”وہ بڑی راہی۔“

”آگے جا کے تو نے ہی پہنچے ہیں“ کوئی تیری ساس تو پہنچ کر ٹھکلتی نہیں پھرے گی۔“

”اوہو...“ وہ گھبرا کے شاید ماں کو اشارے کرنے لگی تھی۔ ماں کو بھی یاد آگیا کہ اس کی ساس کوئی اور نہیں، میری بے بے ہی ہو گی اور میں اندر بیٹھا ہے سب سن بھی سکتا ہوں اور اپنی والدہ کے بارے میں ”ٹھکنے“ جیسا لفظ استعمال کرنے پر برا بھی مان سکتا ہوں۔

”میرا مطلب ہے تیری چیز ہے“ تیرے ہی کام آئے گی۔ اتنی اتاؤ لی اور بے صبری نہ بن۔ لڑکی ذات یہ یہ ٹھڑی ہی اچھی نہیں لگتی۔ جاشابا شیہ اتار کے تہر کر کے ٹرنگ میں سنبھال دے اور وہ عید والا کھٹے رنگ کا جوڑا پس لے۔“

”دنیں اماں..... اب نہیں، وہ..... وہ نعمت ہے نا، وہ آئی تھا۔“

ہوئے میرون اور بلیک روپے کو سیٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”وہ کھوڑا! پسلے ہم زنانیوں کو مصیبت پڑی ہوئی تھی، روپے چادر کی کہ ایسے سنھالو، دیسے اوڑھو۔ اب یہ چنگے بھلے مرد بھی اس کام میں لگ گئے ہیں۔ ادھر آئیں سیٹ کروں تیری جنی۔“

انہوں نے اس کے روپے کے دنوں پلاؤ کا ندھے سے پیچھے کی طرف پھنسکے اور آگے سے کھنچ کے سینے پر ”وی“ کی صورت سیٹ کر دیا اور خود ہی منہ پر ہاتھ رکھ کے ہٹنے لگیں۔ اونچا لبا، پھر کتے مسلز والا سلمان یوں شریف بیبوں کی طرح سینے پر دوپٹہ ڈالے ایسا مضمضکہ خیز لگ رہا تھا کہ میرا تقدیر بھی بے ساختہ بلند ہو گیا۔ سامان نے بھنا کے روپے نوچا۔ اب وہ ہونے والے بہنوں کو تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ ماں کو خڑے دکھاتا دھپ دھپ کرتا ہوا اپر چڑھ گیا۔

”وے گل تے سن جھلیا۔“ ماں اسے منانے لگیں۔ میں بھی فیکری جانے کے لیے تیاری پکڑنے کی نیت سے اٹھا۔ برآمدے میں مڑتے ہوئے اچانک ہی کوثر پر دین سے پاکرا ہو گیا۔ خلاف معمول آج وہ بھی خاصی لشکر رہی تھی۔

اگرچہ گھرے جامنی رنگ کا سوت اس کی سانوںی رنگت کو اور بھی دبایا تھا۔ اس کے باوجود نئے اشائیل سے بنائے بال اور ملکے ملکے میک اپ کے ساتھ وہ ٹھکٹھاک ہی لگ رہی تھی۔ مجھے پار آیا، یہ سوت وہی تھا جو پچھلے دنوں یوشن پڑھاتے ہوئے مسلسل اس کے یاتھ میں رہا۔ اس پر وہ خاصی جانشانی سے کام کر رہی تھی۔ اس کی محنت کا شاہکار یہ ستارے اور موٹی ٹنکا سوت..... آگے سے اٹھا کے بنائے اور پیچھے سے کھلے ہوئے بال، ہاتھوں میں چوڑیاں، پیروں میں پانیب اور میک اپ..... میں پہلی بار اس روپ میں اسے دیکھ رہا تھا، اس لیے میرے انداز میں دیچکی اور وارفتگی تھی۔ وہ پچھے گھبرای گئی۔

”چکھ چاہیے؟“  
”ہاں۔“

”کیا؟“ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔  
”کیسہ۔“

”جی۔“ پہلی بار اس نے اتنے ارب سے مجھے ”جی“ کہا تھا۔ بڑی ”بیوی“ بیوی ”سی لگی۔

جہنمکیوں کی بات کر رہی ہوں۔“

”بُر نظر... بد نیتی۔ ایک ہی بات بار بار کرتی جا رہی ہے۔ کوئی نہیں ملتی وہ جہنمکیاں، کنواری لڑکی کا کیا کام سونے کی چیز سے۔ شادی کے بعد پہننا۔ چمک پھیکی پڑ گئی تو لوگ ملئے دیں گے کہ جھوٹے سونے کا زیور پہنا ہے۔“

”توبہ... کوئی چیز میرے نصیب میں نہیں، ہر چیز کے ہوتے ہوئے بھی ترستے رہو۔ ایک سے ایک پڑرا جو تماور زیور بکسوں میں پڑا سڑ رہا ہے۔ اور میں دس روپے والے لکھنیا ناپس پس کے سورپے کی سینڈل میں جا رہی ہوں۔“

”شکر کرو، بکسوں میں تو ہے۔ اور وہ کو تو یہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اور اللہ خیر کرے۔ پڑا سڑ کیوں رہا ہے۔ بڑے شکنؤں کی چیزیں ہیں۔ بری بات۔ ایسے نہیں کہتے۔ اللہ پہننا نصیب کرے۔ تیری ہی ہیں۔“

وہ اسے بلا پھسلا رہی تھیں اور جوتے کے تمے باندھتے میرے ہاتھ سُت پڑ گئے۔ مجھے بے بے کے کے الفاظ ایاد آرہے تھے۔

”کیا ہوا جو بھا بھی اپنے چار سونے کے سیٹوں میں سے ایک ایک اپنی نندوں کو دے دے۔ دو دو کمبل رضائیاں ایک ایک ڈر سیٹ دے دے۔ پانچ پانچ عمدہ جوڑے انہیں چڑھا دے۔ کوئی فرق پڑتا ہے۔“

”ہاں فرق تو پڑے گا۔ بہت فرق پڑے گا بے بے۔“ اس وقت میں خاموش رہ گیا تھا لیکن اب میرا دل یہ کہہ رہا تھا۔

”بہت پڑے گا اس لڑکی کو جس کے لیے یہ محض جیزی کی چند جیزیں نہ ہوں۔ اس کے کنوارین کے سارے ارمان، ساری خواہشات اور ساری آرزوں میں ان چیزوں میں بند ہوں۔ جس کی انگلیاں گرم روپیوں میں ان چادروں اور روپیوں کو کاڑھتے ہوئے فگار ہوئی ہوں، جس نے دل مار مار کے پائی پائی جوڑی ہوان کو خریدنے کے لیے۔ اور جس کے مال باپ نے اپنے کتنے خرچے اور ضروریات نظر انداز کر کے بھی کے لیے یہ بندوبست کیا ہو۔“

”آخر شوہر کی ذمہ داری، بیوی کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے۔ کل نہ سی، پرسوں سی، تیری شاری تو کرنی ہے۔ کیوں نہ ایسی عورت آئے جو تیرابو جھ بانٹے۔“

بے بے کے فرمودات نے ایک بار پھر مجھے بہ رکانا چاپا۔

”اور میری اپنی ذمہ داری کیا وہ پچھے نہیں؟ آئے دل تو

تحتی اور اس کے ساتھ بے بی بھی تھی، ان دونوں نے مجھے اس نے جوڑے میں دیکھا ہے، اب اگر میں اتار کے گرانا والا پس لوں گی تو وہ سو باتیں بنائیں گی۔ میں نہیں بد گئے والی۔“

بہت آہست آواز میں وہ ہٹ دھرمی سے کہہ رہی تھی۔ میں اندر شرٹ پہنتے ہوئے مسکرا دیا۔ وہ کسی نیعہ میا کسی بے بی کی وجہ سے نہیں بلکہ میری وجہ سے ایسا کہہ رہی تھی۔ ”اچھا، مر پھر۔“ اکتا کے وہ اجازت دے جیئھیں، مگر بے شمار بد ایات کے ساتھ۔

”دھیان رکھنا، کوئی داغ نہ لگے۔ پلیٹ بھر کے نہ کھانے بیٹھ جانا۔ ادھر کسی نے موندا (کاندھا) مارا، ادھر سارا سالن اوپر گرا۔ اور نہ مہندی لے کر آگے آگے ہونا۔ جالی کا دوپٹہ آگ جلدی پکڑتا ہے۔ اور مہندی کا داغ بھی نہیں اترتا۔“

”اوہ، اوام! اس رنگ پر کون سا داغ لگ سکتا ہے۔ دیے بھی مہندی کی رسم میں آگے کس نے ہونے دینا ہے۔ باجی ساجدہ کی ساری بھنیں بڑی شریاں ہیں۔ انہوں نے تو بھا حنیف کے گھر والوں کو کونے میں لگا رکھا ہے۔ اچھا اماں! وہ وہ جہنمکیاں تو نکال دینا۔“ اس نے بڑے منت بھرے لمحے میں کہا۔

”کون سی جہنمکیاں؟“ ”وہی، جو میں نے کمیٹی نکلنے پر بنوائی تھیں۔ بزرگوں والی، وہ اس جوڑے کے ساتھ پہنول گی۔“

”آرام سے بیٹھ جوڑا پہننے کی اجازت کیا دے دی۔“ چھتری کی طرح چوڑی ہوتی جا رہی ہے بھول جادہ جہنمکیاں۔“ ”کیسے بھول جاؤں، میں نے اپنی یوشن کے پیسوں میں سے کمیٹی ڈالی ہے۔ ابھی ڈریڑھ سال تک ہر میئنے چار سو روپے دینے ہیں مجھے۔ وہ میری جہنمکیاں ہیں اور میں آج پہنول گی۔“

”زیادہ رعب نہ ڈال میرے، یہ اپنی چار سو کی کمیٹی کا، جسے تیری وہ کمیٹی نہ نکلتی تو تو نے کبھی سونے کی شکل نہیں دیکھنی ہھی۔ یا تیری ان تو لے بھر کی جہنمکیوں کی بھوکی بیٹھی ہوں میں۔ سیر سونا تھا، میرے پاس جیزرا اور بری کا۔... بڑے وقتوں میں کافی بک گیا۔ تیرے اور فوزیہ کے لیے دو دو سیٹ اور کڑے بچا رکھے ہیں۔ سلمان کی دوہشی کے لیے۔“

”میں اس سیر سونے کا نہیں پوچھ رہی۔ اپنی

ہیں۔ آج ساتھ دالے گھر میں شادی ہے، وہاں جانے کے خیال سے کچھ نہیں پکایا تھا۔ ہمارا سارا اُبیر سدا (مدعو) ہوا ہے۔“

”تو پھر ہم بھی روئی وہیں کھالیں گے۔ نہیں ہم بھی تو شامل ہیں۔“

بے بے نے کی بات پر ماسی کچھ جز بز ہوئیں شاید وہ بن بلائے مسمانوں کی نفری میں اضافہ کر کے باہمی ساجده کی باشیں نہیں سننا چاہتی تھیں۔

”پر شادی ہے کس کی؟ اس مُجهز کے بال تو بڑے چھوٹے ہیں۔

”وہ نہیں نہیں... پچھے تو واقعی بہت چھوٹے ہیں۔ ان کی کہاں سے شادی ہو گی۔ شادی تو اس...“

”اچھا اچھا، آپ شادی کر رہا ہے؟ رو جی؟“ بے بے نے پوری بات سے بغیر اندازہ لگایا۔

”بڑی خوشی ہوئی۔ جی بڑی خوشی۔“ وہ مارے خوشی کے جھونٹنے لگیں۔ ”بڑا اچھا کیا۔ ایسی تارے لانی۔ زنانی کے ساتھ کس کا گزارا ہو سکتا ہے۔ اچھا ہے، سو کن سرہ آکے بینٹھے گی تو ذرا آکر ختم ہو گی۔ اس کی۔“

وہ یقیناً ”ساجده باہمی“ کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ میں نے گھبرا کے انہیں خاموش کرانا چاہا، کیونکہ باہمی چوبیں میں سے بیس گھنٹے تو دیوار کے ساتھ لگ کے گزارتی تھیں۔ اگر یہ زریں فرمودات ان کے کاؤنوس میں پڑ جاتے تو بے بے کے ساتھ ساتھ ماسی اور ان کے گھروالوں کا وہاں جانا بھی منسوخ ہو سکتا تھا۔

”شادی بھا خنیف کے چھوٹے بھائی کی ہو رہی ہے۔“ میں نے ان کا ہاتھ دبا کے اطلاع دی۔ وہ ایک دم مُھنڈی پڑ گئیں۔ پھر افسوس بھرے لہجے میں کہنے لگیں۔

”اس کا بھائی بھی تھا؟“

”تھا نہیں ہے۔“ میں نے تصحیح کی۔

”سو تارے۔ اب ہمارے کس کام کا۔ نی بتولاں تو بھی کسی کام نہ نہیں۔ ساتھ والوں کا بھائی اتنا کنوارہ، اتنا کنوارہ اور تو میری کسی بیٹی کا رشتہ نہیں ڈال سکتی تھی؟“

میں نے محسوس کیا کہ جب سے میری کوثر سے بات طے ہوئی تھی۔ بے بے کے لمحے میں ایک کڑ فراور ڈنٹر آگیا تھا۔ ”خصوصاً“ ماسی سے بات کرتے ہوئے۔ اور ماسی کا دب کربات کرنا بھی صاف محسوس ہوتا تھا۔

”خنیف کا بھائی مقصود (مقصور) بڑا پڑھا لکھا ہے۔“

میری ذمہ داری بانٹے لیکن میں اس کی ذمہ داری نہ اتنا ہوئی ہے۔ کیا یوں صرف بوجھہ بانٹنے کے لیے ہوتی ہے۔“

اس سوال نے مجھے بو جھل کر دیا۔

پچھے دیر قبل کوثر سے ہونے والی بلکل پھلکی باتوں نے جس لطیف احساس سے دوچار کیا تھا وہ کیفیت زائل ہونے لگی۔ اس کی جگہ ایک احساسِ جرم نے لے لی۔



شادی کا دن تھا اور سیلے کی طرح اس روز بھی بے بے بغیر اطلاع کے آگئیں۔ ایک تو محض پندرہ بیس دن کے بعد ہی ان کا دوبارہ لاہور آنا ہی میرے لیے باعث حیرت تھا اس پر وہ تینوں بھنوں کو بھی ساتھ لے آئیں۔

”جب سے انہیں بھا بھی کے بارے میں بتایا ہے،“ تب سے پھل رہی ہیں کہ بس بھا بھی دکھلاو۔ بھا بھی دکھلاو۔ دن رات ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ میں نے کما چل آپھر۔ چار دن رہ آتے ہیں۔ میرا اپنادل اوس ہو رہا تھا اپنے بیٹے اور بسو کو دیکھنے کے لیے۔“

پیے بے اور لگاؤت کا ایسا بھرپور مظاہرہ، ناقابل یقین سی بات تھی۔ چونکہ شادی پر جانا تھا، اس لیے دوپر کا کھانا بھی تیار نہیں تھا۔ ماسی نے بھلکدڑ مچا دی۔ فوزیہ اور کوثر جو تاریوں میں مگن تھیں۔ اب پھر جا کے کھانا پکانے کے خیال سے منہ لٹکا کے رہ گئیں۔

”سلمانا، سلمانا دے۔“ پچھے اتر جا کے ایک مرغی پکڑ لا۔ آنا بھی نہیں گوندھا، چھ سات نان لے آنا۔ اتنے میں کوثر تو مسالہ بھنوں کے تبار رکھ۔“

”ہائے ہائے۔ اتنی۔“ شکر دوپر ہو گئی اب تک ہانڈی نہیں چڑھائی؟“

بے بے نے ناک بھنوں چڑھائی، پھرنے سرے سے کوثر کا جائزہ لیا جو نیا جوڑا پسے، بھر بھر چوڑیاں کلائیں ڈالے، نیم گیلے بالوں کو سلچھاتی ہوئی یوں کھلا چھوڑ کے انہیں سلام کرنے آگئی تھی۔ اور فوزیہ وہ توفل تیاری میں تھی اور اپنی سر جھاڑ منہ پھاڑ بیٹیوں کے مقابلے میں انہیں یہ تیاری خاصی ہٹکی۔

”اپنا ہی منہ بو تھا شکانے میں جو لڑکیاں لگی رہیں۔ ان کے چوڑے ایسے ہی اٹھے پڑے رہتے ہیں۔“

”نہیں نہیں بہن! میری لڑکیاں تو کام کا ج میں بڑی تیز

پھر نے کے پروگرام بن رہے تھے۔ مجھے مامارحمت کی ساری آمدی اسی میں غرق ہوتی نظر آرہی تھی اور یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

بایجی ساجدہ کی دیورانی کے جیز کو دیکھ کے بے بے کو جس فکر نے گھیرا تھا وہ بھی بس وقتی احساس تھا۔ اگلے ہی دن انہوں نے اس تشویش سے چھٹکارا حاصل کر لیا کہ کیا بھی وہ بھی اپنی بیٹیوں کو اس شان سے رخصت کر سکیں گی یا نہیں۔ اس کے بجائے انہوں نے اٹھتے بیٹھتے اس جیز کی اعزیزیں اور نئی دلمن کے ماں باپ کے بڑے دل کے قصیدے پڑھنے شروع کر دیے۔

”واہ..... لڑکی بیا ہو تو اس شان سے بیا ہو۔“ کوئی تیسرا بار انہوں نے سردھن کے کھاتوں مجھ سے رہانہ کیا۔  
”ورنہ نہ بیا ہو؟ ہے نا؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب جیسے ہم فاطمہ اور مر کو نہیں بیاہ پا رہے۔“ میں نے آواز دبا کے کہا۔ وہ مجھے بڑی طرح گھورنے لگیں۔ ”سوہرے بیٹھ کے جوائی کتے بن یہ جاتے ہیں یہ تو منا تھا،“ مگر یہ پہلی بار دیکھا ہے کہ گھر جوائی تیربن کے ماں پر دھاڑ رہا ہے۔

”میں گھر داماد نہیں ہوں۔“ مجھے شدید غصہ آیا۔ شکر ہے کہ بے بے کی صبح سے وقفے وقفے سے جاری کنیلی گفتگو سے گھبرا کے ماں اندر جا چکی تھیں اور کوثر توبے بے کے سامنے زیادہ آتی ہی نہیں تھی۔ پتہ نہیں شرم و جھجک کی وجہ سے یا پھر ان کی ایکسرے مشین جیسی نظروں سے خائف ہو کے۔“

”تیور تو تیرے وہی ہیں۔ میں کل سے دیکھ رہی ہوں ہر بات میں اعتراض کر رہا ہے۔ بہنوں کے اٹھنے بیٹھنے پر اعتراض، ان کے گھونے پھرنے پر اعتراض، ماں کے کھانے پینے پر اعتراض، بڑا درد جا گتا ہے لیکے میں، اپنے سوہرے کی گماں کا۔“

”آہستہ بولو بے بے۔ اور جب سے کمانا شروع کیا ہے مجھے محنت سے کمانے والے ہر بندے کی کمائی کا اتنا ہی درد ہوتا ہے۔ جہاں تک اعتراض کی بات ہے مجھے آپ کے کھانے پینے یا بہنوں کے تفریغ کرنے پر اعتراض نہیں۔ اگر وہ میرے خرچ سے ہو۔ مامارحمت اور ماں کو تکلیف دینے کی لیا ضرورت ہے۔“

”ہم ان کے مہمان ہیں۔“

سرکاری افسوس۔ ان کے خیال ہی بڑے اوپنچے تھے۔ کسی بڑی اور اوپنچی جگہ ہاتھ مارنا چاہتے تھے۔“

”کیوں میرا حیدر بخت پر اکھا نہیں۔ اچھی نوکری نہیں ہے اس کی؟ میں نے بھی تو۔“ اگلا فقرہ انہوں نے منہ میں مہن من کرتے ہوئے مکمل کیا، جو پوری طرح سنانہ جاسکنے کے باوجود ماں کو سمجھ میں آگیا۔ وہ سر جھٹکا کے رہ گئیں۔ شاید انہمار ممنونیت کے لیے۔ اور میرا سر شرمندگی سے جھٹک گیا۔

”مجھے تو جی خدا کا خوف ہی رہا ہے۔ چاہتی تو میں بھی اپنچی جگہ بیٹھ کار شتہ کر سکتی تھی لیکن۔“

”لیکن آپ کے جانے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔“ میں نے بے وقت مداخلت کی ورنہ وہ یونہی ماں کا دل برداشت رہتیں۔

”اوپنچی جگہ والے بھی کچھ دیکھ کے ہی بیٹھ کا ہاتھ دیتے ہیں۔ بھا خیف کا بھائی سرکاری ملازم ہے۔ بہت بڑا افسوس سی مگر نوکری تو کی ہے اور ایسی ہے۔ جس میں کھانے کھلانے کی خاصی تنجاکش ہے۔“

”مریں دونوں..... رشوٹ خور جسمی کھانے والے بھی اور کھلانے والے بھی۔“

بے بے کو انگور کھٹے لگے تو کہنے لگیں۔

”چلو رکھتے ہیں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں اس جھوکری میں جو ساجدہ جیسی خریلی اسے اپنی دیورانی بنا کے لارہی ہے۔“

اور وہاں جا کے انہیں سرخاب کے وہ سارے پر نظر آگئے۔ وہ لمبا چوڑا جیز، وہ نئی پچھائی موز سائیکل۔ وہ پانچ سونے کے سیٹ، وہ لمبی چوڑی نقد سلامیاں... وہ اپسی یہ وہ خاصی بھجی بھجی سی تھیں۔ بار بار فاطمہ، مہر اور نبیلہ کی طرف دیکھتیں اور سرد آہ بھر کے رہ جاتیں۔

دوسری طرف ماں کی مہمان نوازی یعنی ہے تھی۔ پہلے بھی بے بے کی کم آو بھگت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس بار یاتھیں الگ تھی۔ اب وہ ماں کی رشتہ کی بہن نہیں رہی تھیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کے سدھن بن چکی تھیں۔ بے بے کو بھی اپنے لڑکے کی ماں ہونے کے اسٹیشن کا پورا پورا دیکھاں تھا۔ اس لیے بھڑلے سے سارے حق و صول روئی تھیں۔ لیکن مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک یادو نہیں کیا پورے پانچ اضافی خرچے، اور دن میں دو دو بار ایسا پر تکلف لھانا۔ بھی پھل بھی کو لڈڑنک تو بھی گھونے

ہے؟”  
”اور وہ جو گھر جوائی والا طعنہ۔“  
”غصے میں منہ سے نکل گیا تھا۔ اب کیا تو اس کے پیچے اپنی شخواہ برباد کرے گا۔ پا غلام تیرے آرام کی خاطر تو میں نے یہاں تیری بات چلائی ہے، ورنہ میری آنکھیں تو اب کھلی ہیں۔ اب پتہ چلا ہے کہ میرے چار تو لے سونے اور لکڑی کی کرسی میز اور مکبلوں کے پیچے ایسی سوکھی سڑی لمبی لڑکی بنو بنا کے لانا، کتنی بڑی بے وقوفی ہے۔ لوگ اس سے بھی کتنی گزری بھوئیں لے آتے ہیں۔ مگر کچھ دیکھ کے جو بھو صرف اپنے جو گا جیز لائے وہ جس کام کا، برتن کپڑے کھنے اس نے خود استعمال کرنے ہیں۔ فیدہ تب ہے جب وہ ہمیں بھی کچھ دے۔ مجھے موڑ سائیکل یا لاکھ دولاکھ روپیہ ملے۔ پھر بھی اگر میں اب تک چپ ہوں تو اس لیے کہ چلو برا دری کی لڑکی ہے، شکل کی خاصیتیں تو کیا ہوا۔ جیز بھی بس گزارے لائق ملتا ہے۔ لیکن کسی بھانے تیری تو بچت ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں کہ تک اس شہر میں تیرا رزق بندھا رہے۔ اس گھر کی وجہ سے کم از کم مجھے کرائے کے مکان کی فلکرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ اور تو ہے کہ چلا ہے اپنا گھر ڈھونڈنے۔“

مجھے اچھی طرح جھاڑ پوچھ کے رکھنے کے بعد انہوں نے دوبارہ برقدہ اٹھایا۔

”اب کہاں؟“

”پولی طرف، خروں کا گناہ کیجئے۔“ جل کر جواب دیا گیا۔

”اور کہاں جانا ہے۔۔۔ یہ زر اسی جدہ کی طرف چلی جاتی ہوں۔ اس دن شادی پہ کہہ رہی تھی کہ آپ کسی دن آنا میرے پاس۔“

”وہ بے بے۔۔۔ ماسی نے وہاں میری اور کوثر کی منگنی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس لیے زر احتیاط کرنا۔۔۔“ میں نے جھمکتے ہوئے کہا۔

”پتہ ہے پتہ ہے۔“ انہوں نے بے زاری سے کہتے ہوئے باہر کی راہی۔



بے بے جب سے بھائیف کے ہاں سے آئی تھیں ان کا روپیہ خاصا پراسرار تھا۔ ماسی کی لگاٹ بھری باتوں کے جواب بھی اس ہاں میں دے رہی تھیں۔

”مسماں ایک یا دو دن ہوتا ہے۔ آپ کو یہاں آئے ایک ہفتہ ہونے والا ہے۔ اپنا گھر بار اتنے دنوں کے لیے چھوڑنا کوئی تکمیل کی ہاتھ ہے۔؟“  
”میں ابھی چلی جاتی ہوں۔“ بے بے فوراً ”گھری ہو گئی اور گھونٹ پہنکا اپنا نوپی برقدہ اتار کے پہننے لگیں۔  
”کتنی چچھ رہی ہے مال۔۔۔ میں بھی کہوں میرے آتے ہی منہ کیوں بن گیا تھے، ہاں ہاں۔۔۔ اب وہ آزادیاں کہاں؟ سارا دن اس سریل کے ساتھ ہنسی شاخشوں اور آنکھیں منکا چلتا ہو گا میرے آنے سے تو پابند ہو گیا ہے اس لیے مجھے بھیجننا چاہ رہا ہے۔“

”بے بے۔۔۔ بے بے۔۔۔ خدا کا خوف کرو۔“ میں اس کھلے بہتان پر ترپ گیا۔ شدید غصے میں بھی مجھے اس بات کی پروا تھی گہ بے بے کی آواز کمرے سے باہر نہ جا رہی ہو۔

”کوثر ایک شریف لڑکی ہے اور نہ ہی ماسی کے گھر کے ماحول میں ایسی خرابی بتے جو یہ سب کیا جاسکے۔“  
”ہاں کوثر شریف، اس کی ماں شریف، ایک میں ہی بد معاش ہوں۔“ وہ سرپہ ہاتھ رکھ کے رو نے لگیں۔ نئی مصیبت۔

”نی فاطمہ، نی مرے۔ چلوںی ساریاں، سامان باندھو، اپنے گھر چلو۔“

”بے بے تماشانہ لگوائیں۔“ میں نے ان کا برقدہ اتار کے دوبارہ ٹانکا اور شانوں سے تھام کے دوبارہ بھایا۔ اب میرے اندر میں خوشامد اور التجا تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بے بے کے اس طرح مشتعل ہو کے جانے سے ماسی کا دل برا ہو۔ ان کے اتنے دنوں کی مسماں نوازی پہ پانی پھر جانا تھا۔

”میں کل خود چھوڑ کے آؤں گا۔ دو چھٹیاں بھی لے لوں گا۔ اور داپس آکے اپنے لیے کرائے کا مکان بھی تلاش کرنا شروع کروں گا۔ پھر آپ اور بھنیں شوق سے آنا اور میرے اپنے گھر میں پورے حق کے ساتھ رہنا۔ تب میں نے کسی بات پہ کوئی اعتراض کیا پھر کہنا۔“  
”پاگل ہوا ہے؟“ بے بے کا سارا غصہ رفوچکر ہو گیا۔

اب ان کے چھرے پہ بے پناہ تشویش تھی۔

”کتنی شخواہ سے تیری جو کرائے پہ مکان لے کر رہے گا۔ کرائے پہ جور قم جھونکے گا کیا وہ تیری بیس کے کام نہیں آسکتی۔ بیٹھا رہ آرام سے ادھر، یہاں مجھے کیا تکلیف

"فیر حیدر! چلنا ہے کل میرے ساتھ؟ تو کہہ رہا تھا ناک  
دو چھٹیاں لے کر میرے ساتھ چلے گا، ہمیں جھوڑنے۔"

"کل؟ کیا آپ واقعی کل جا رہی ہیں؟" مجھے حیرت تھی  
کہ کیا بے بنے واقعی میری باتوں کو سنجیدگی سے لیا ہے  
یا آنا" فانا" یہ واپسی کا پروگرام بنانے کی کوئی وجہ ہے۔  
ماں بتول اس نے بھی مزید رکنے پے واجبی سا اصرار کیا۔  
اگلے دن صبح جب میں بے اور بہنوں کے ساتھ نکل رہا  
تھا تو انہوں نے نہ کر خود ہی کہا۔

"سوچ رہی ہوں، اگلے منٹے۔ میں بھی ڈونگے بو نگے  
آؤں۔ بھی رسم جو بھائی ہوئی۔ اب حیدر بختاں میرا پتر  
ہے۔ اس کے لیے کوئی شکن وغیرہ تولانا ہو گا۔"

اگرچہ لے لے اس بار بھی آتے ہوئے، شگن کے نام  
پے کوثر کے لیے دھجی تک نہیں لایا تھیں۔ پھر بھی ماں کسی  
رسم کو بھانے کی بات کر رہی تھیں۔ بے بے کی خاموشی  
اور گھری ہو گئی۔ ان کے آنے کی بات پے جب دوسری  
جانب سے کوئی خیر مقدمی لکھے یا حوصلہ افزایاں نہیں کی گئی  
تھیں بے چاری بھی چپ ہو گئیں۔  
ربے بے کی خاموشی اور اچانک واپسی کا راز اپنے گھر جا  
کر کھلا۔



میں دو چھٹیاں لے کر اپنے گھر گیا تھا۔ تیسرا دن اتوار  
تھا، یعنی ایک اور چھٹی مگر میں مشکل ایک، ہی دن وہاں تک  
سکا۔ نہ بے بے میرا موقفہ منٹے پے تیار تھیں، نہ ہی میں ان  
کا مطالبہ ماننے پے راضی، جب دنوں میں سے ایک بھی اپنی  
ضد سے ٹھنپے تیار نہ ہو تو ماہول میں خود بخود ایک بخی سی  
پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی بخی سے نجات پانے کے لیے میں  
لاہور واپس آگیا۔ وہاں پیدا ہونے والی بد مرگی کے اثرات  
میرے چہرے پر رقم تھے۔

"خیر تو ہے حیدر بختاں۔" ماں نے میری چپ بھانپ  
کر کچھ خوفزدہ انداز میں پوچھا۔ یہ خوف انہیں بے بے کے  
تیوار دیکھتے ہی لاحق ہو گیا تھا۔

"جی ماں سب خیر ہے۔"

"تو پھر منہ کیوں اترتا ہوا ہے؟"

"اچھا ہے نا، چڑھا ہوا منہ بھی کوئی دیکھنے والا ہوتا  
ہے۔" فوزیہ نے اپنی عقل کے مطابق میرا دفاع کیا۔  
میرے لبیں پے ایک پتھکی سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"میں نے سوچا تھا، تم آؤ تو میں ایک چکر لگا لوں تھا میری  
طرف کا۔ یہاں نہ سکی، برادری میں تو بات نکال دینی  
چاہیے۔ یہ گرمیاں گزر جائیں۔ ٹھنڈے مہینے کی کوئی  
تاریخ بھی رکھ لیں گے۔"

"میں ماں۔" میں گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ہمگا بکا مجھے دیکھنے لگیں۔ میں نے جلدی سے اپنے  
چہرے کے تاثرات چھپائے اور بات بدمل۔

"میرا مطلب ہے ابھی وہاں نہ جانا۔ بہت گری ہے،  
اتنی گری میں بسوں کا سفر۔ میری طبیعت بھی تو اسی وجہ سے  
خراب ہے اور آپ کو چپ چپ اور اراداں لگ رہا ہوں  
در اصل سفر کی گری نے اندر سے ٹھوڑے کے رکھ دیا ہے۔ بے  
بے بھی جاتے ہی یہاں پر گئیں۔"

"ہیں؟ ریماں یہاں ہو گئی؟ پہلے بتانا تھا۔ میں خیرت  
پوچھنے کافون ہی کرتی۔ کیا سوچتی ہو گی وہ..... فوزیہ، اندر  
سے فون تو اٹھا کے لا۔"

"وہ ماں.... کوئی فائدہ نہیں فون کرنے کا۔" میں سخت  
جزبز ہو رہا تھا۔ جتنی کوشش کر رہا تھا لیکن بے بے سے  
بات کرنے سے باز رکھنے کی۔ اتنا ہی وہ تکی بیٹھی تھیں۔

"فون والے ہمایے چھٹیاں گزارنے بھاولپور گئے  
ہوئے ہیں۔" بروقت بمانہ سوچ گیا۔

"ماں ہائے یہ بڑی مصیبت ہے۔ تو میں کو فون کیوں  
نہیں لگواریتا؟" اب یہ ایک نئی بحث چھڑنے جا رہی تھی  
جس سے گھبرا کے میں نے نکلنے کی فکر کی۔

"کہاں جا رہے ہو بھائی حیدر؟" باتی ساجدہ کا سریکا یک  
دیوار سے آگا۔ پہلے میں اچھا بھلا سادہ سا حیدر ہوا کر تھا۔  
آج انہوں نے بھائی کا تڑکا لگا کے زیادہ ہی اپنائیت جانی  
چاہی اور میں اس نئی نئی پیدا شدہ اپنائیت کے سارے  
اسباب جانتا تھا۔ اس لیے خاص رو عمل ظاہر نہ کیا۔ روکھا  
سامنہ بنانے کے جواب دیا۔

"تمہارے بھائی تم سے بڑا ادارا ہو رہے تھے۔"

"میں بھائیوں سے مل کے ہی آ رہا ہوں۔"

"ایں....؟ نہیں وہ بھائی نہیں۔ تمہارے یہ والے  
بھائی۔" اب کے ذرا شرم کے کہا گیا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ حیدر بہت دنوں سے ملنے نہیں  
آیا۔ اس محلے میں ایک تم تو پڑھے لکھے اور سمجھ دار بندے  
ہو۔ تم سے ہی ان کا غم تھا۔"

"اور میری اس محلے میں سب سے زیادہ جا چے شہر پاس

من سے تیرے لیے بات کی ہے۔ اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اس کے باپ نے اپنی اس آخری بیٹی کو پہلی تینوں سے بڑھ کے جیزیرے کا فصلہ کیا ہے۔ اور جیزیری کوئی ایسا رینا نہیں۔ اس کی دیواری کے مقابلے کا۔ بارات بھی وہ کسی اتنے ہوٹل میں ٹھہرائیں گے اور کھانا۔“

”بس کرو بے بے... یہ کوئی مذاق ہے یا گذی گڈے کا کھیل۔“

”زیادہ اونکھانہ بول، ماں ہوں میں تیری۔ جدھر میری مرضی ہو گی ادھری تیرا شستہ کروں گی۔“

”پہلے بھی میں نے آپ کی مرضی پر سر جھکایا تھا، لیکن اگر آپ کی مرضی آئے دن یونہی بدلتی رہے گی تو میں ہریار ایسا نہیں کر سکتا۔“

”کیوں نہیں کر سکتا؟ وہ آیا اپنی مرضی چلانے والا، اگر اپنی مرضی کی وہی لانی ہے تو خود شادی کرنا۔ دیکھتی ہوں بغیر ماں باپ کے کون شریف زادی تیرے ساتھ آنے پر راضی ہوں ہے۔ جو چھڑے چھانٹ کو جوائی بنائے گا وہ سب سے بڑا رزیل، پھر اپنی زنانی کو لے کر انہی پنج لوگوں کے ساتھ رہنا۔ تمیں نہیں چاہیے وہ بہو جس سے نہ کوئی فائدہ نہ سواد، اگر ماں کو خوش گر کرے رب راضی کرنا ہے تو پھر ساجدہ کی بسن سے شادی کرنی ہو گی۔“

”پتہ نہیں ایسے رب راضی ہو گایا قبر نوٹ گا کوئی..... میں کوئی دلی تو نہیں بے بے! نہ ہی کوئی نیک نمازی بندہ، لیکن اتنا احساس ضرور ہے کہ کسی کامل توڑنا اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہے۔ کسی کو امید لگا رہنا۔ آس دلانا اور پھر ایک جھٹکے سے، میں بے بے! یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔“

کوثر کی صورت نظریوں کے سامنے پھر نے لگی اور ماسی کی محبت یاد آنے لگی تو میں بے بیس پڑ گیا۔ لیکن بے بے میرا کوئی بھی عذر سخن پر تپار نہیں تھیں۔

”کوئی نکاح نہیں جو توڑنہ سکے اور ان کو کیا فرق پڑتا ہے۔ انہوں نے منگنی کی خبر ہوا کوئی نہیں ہونے دی۔ کون سا لڑکی کی بدنای ہو چلی ہے جو ہم سوچنے پڑھیں۔“

”ہاں اس زبانی کلائی کی خبر تو کسی کو نہیں۔ لیکن مجھے.... مجھے تو پتا ہے کوثر کو تو پتا ہے۔ کاش، میں بھی پستہ چلتا اور ہم بھی، اس خوبصورت رشتے سے بے خبر اور انجان رہتے۔ تب واپس پلٹتا کتنا آسان ہوتا۔ یوں تو مگسوس نہ ہوتا جیسے اب ہو رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے واپس کے رستے

سے بنتی ہے۔“ میں نے انہیں کلسانا چاہا۔ بے بے کے دماغ میں جو کیرا کلبلا نے کے لیے انہوں نے چھوڑا تھا۔ اس جرم کی پارا ش میں، میں ان کے ساتھ جو بھی کرتا دہ کر تھا۔

”دفع یہ... وہ بھی کوئی بندہ ہے۔ خسروں کا داروغہ۔ تمہارے بھائی نے آج صاف کہہ دیا ہے اسے کہ اپنے کرانے دار اتنے لاڈلے ہیں تو طریقے سے رکھو انہیں۔ ان کے آنے جانے کے لیے پچھلا دروازہ استعمال کراو۔ خبردار جو یہاں سے ڈھولک انہائے گزرتے نظر آئیں تو...“ میرے نکلتے بھی انہوں نے معلومات میں اضافہ کیا۔ مگر میں نے رکنا گوارانہ کیا۔ انہوں نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ بے بے کو اپنی بسن کالا را لگایا تھا۔

”میں کم عقل، جلد بازا تازی۔ کتنی جلدی کی میں نے فیصلہ کرنے میں۔ اور جلدی کا کام تو ہوتا ہی شیطان کا ہے۔“ مجھے بے بے کی ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔

”مجھے تو لگتا ہے بتولی نے گھر کی چوکھت میں کوئی تعویذ دبا کے رکھے ہیں۔ اندر جاتے ہی بندے کا دماغ چوپت ہو جاتا ہے۔ جیسے تجھے دیاں جاتے ہی ہوا لگ گئی۔ ایسے ہی میری بھی عقل ماری گئی۔ ادھر گئے دو گھنے ہوئے نہیں کہ میں نے لڑکی کا رشتہ مانگ لیا۔ بھی بڑے تگڑے تعویذ ہیں۔ کوئی پسچاہو ابابا پکڑا ہے بتولی نے۔ لیکن میں بھی ڈھیٹ مٹی ہوں۔ کالے سے کالا تعویذ بھی مجھے زیادہ دری تک دبا نہیں سکتا۔ آخر مجھے ہوش آہی گیا۔ اور یہ ہوش مجھے ساجدہ نے دلایا۔“

”کیا سنگھاریا انہوں نے؟“ میں نے بے دلی سے پوچھا۔ ”سنگھاریا نہیں، دکھایا ہے، اپنی چھوٹی بہن دکھائی ہے۔ اتنی سوہنی، اوچی بھی جوان لڑکی۔ دیکھ کے پتہ چلتا ہے کہ کسی کھاتے پتی گھر کی ہے۔ اس کوثر کی طرح ہڈیوں کی مٹھے نہیں ہے۔“

”جیسی بھی ہے، ہمارا کیا لینا دینا باجی ساجدہ کی بین سے۔“ خطرے کی ٹھنڈی کیس آس پاس اسی وقت بھی ٹھنڈی لیکن میں نے نظر انداز کرنا چاہا تھا۔

”یہیں تو ہو گا سارا لینا دینا۔“ انہوں نے ”وہ مارا“ کے انداز میں لعروہ باند کیا۔

”وہ بتولی،“ کیا رے گی تو کیا لے گی۔ ساجدہ نے اپنے

کے کہا۔

”کیوں اپنے پسند کی بو سے بچے کو بھگانا ہے۔“

”رہنے والے چاچا..... جو تیری بو کا عادی ہو جائے اے پھر گندے نالے کی بو بھی نہیں پچھے کہتی۔ اور انہم تو کدھر خلی؟“ بات کرتے کرتے اس نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا، جو میلی سی دھوتی اور گردے بزر کرتے میں ملبوس باہر نکل رہا تھا۔ آدھے گنجے سروال ایسے بھرا بغیر وگ، میک اپ اور زنانہ لباس کے بست الگ الگ محسوس ہوا۔

”کوئی رزق روٹی کا بندوبست کرنے۔“ البتہ اس کی گفتگو کا اندازہ تھا جو اس کے ساتھیوں کا۔

”اور کتنی بار کہا ہے مجھے اب انہم نہ کہا کر۔ میرانام اشرف ہے۔“

”چل اشرف ہی سی..... تو بُن اشرف، مانا کہ اب تیرا جی ناچنے گانے میں نہیں لگتا لیکن تو نے اتنے سال نہیں ناج کے کھلایا ہے۔ میں اور ملکہ تو اتنی سی ہوتی تھیں تو نے اور باتی زمرد نے ہمارے بڑے چاؤ پورے کیے ہیں۔ ہماری تو ماں، باجی سب تم ہو۔ اب تمہاری عمر ہو گئی ہے۔ اشرف باجی تو کیا ہم لوگ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ تمہیں بٹھا کر کھلا میں۔ کہاں اب اس عمر میں جمل خوار ہوتی پھر وگ۔“

”کیوں نی؟ کتنی عمر ہو گئی ہے میری؟“ رانی کی اس محبت کے جواب میں اشرف باجی نے کمرہ ہاتھ رکھ کے نشک کر کہا۔

”اپنی سولہ سال کی جوانی کے خمار میں نہ رہنا۔ ہم خردوں کی عمر ہر سال تین چھلانگیں مارتی ہے۔ آج تو سولہ کی ہے اگلے سال بیس کی ہو گی۔ اور میرے بھی ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ ان کے لیے جوڑ کر رکھ جو بچھے پیدا ہونے کے تین گھنٹے بعد ہی ہمارے متھے مار گیا تھا۔“

وہ فوں فوں کرتی باہر نکل گئی۔ یا نکل گیا۔ رانی کا نوں کو ہاتھ لگانے لگی۔

”باجی انہم تو بڑی کٹ کھنی ہو گئی ہے۔ ناں چاچا تو بتا میں نے کوئی مارڈی بات کی ہے۔“

لیکن چاچا نیم پاس کوئی جواب دینے کی بجائے بڑیزانے لگا۔

”یہ تیری اشرف باجی پھر سنت کے دروازے سے نکل گئی ہے۔ نا نہیں کہ وہ حنیف کیا آرڈر دے گیا تھا کہ آج سے تم سارے پچھلی گلی والے دروازے سے باہر آؤ جاؤ۔“

پہ کہ جیاں ہی کہ جیاں بکھری ہوں۔“  
میں بال مٹھیوں میں بچپن سوچتا رہا۔ بے بنے مجھے مسلت دی۔

”اچھی طرح سوچ لے،“ میں کوئی تیری دشمن نہیں، نہ تیرے ساتھ زور زبردستی کر سکتی ہوں۔ کوثر سے شادی کرے گا تو اگلے بیس سال تک یوں اور اولاد کے خرچے پورے کرنے کے ساتھ ساتھ ہم چار جانوں کی ذمہ داریاں بچھی پوری کرنی پڑیں گی۔ بہنوں کے فرض سے ہلکا ہو گا تو تیری اپنی اولاد جوان کھڑی ہو گی۔ ساجدہ کی بہن سے کرے گا تو کاروبار شروع کرنے کے لیے پیسہ ملے گا۔ بہنوں کی شادی کے لیے مدد ملے گی۔ اولاد بھی اچھی طرح پل جاتی ہے۔ اگر ناتانے (نہیاں) کھاتے پیتے ہوں۔ ہر موقع پر بیٹی اور اس کی اولاد کو دیتے دلاتے ہیں۔ جیزرا تناکہ گھر بھر جائے گا۔ ساری زندگی اپنے گھر کے لیے کچھ خریدنے کی ضرورت نہیں پڑے کی وجہے۔ فیصلہ تیرے ہاتھ ہیں ہے۔ اچھی طرح سوچ لے۔“

اور میں اس وقت سے یہی سوچ رہا تھا۔ اسی سوچ نے مجھے الجھایا ہوا تھا۔ میری ابھسن یہ نہیں تھی کہ میں کوثر اور باجی ساجدہ کی بہن میں سے کسی کا انتخاب کروں۔ اس سلسلے میں میراڑ، یعنی بے حد واضح تھا اور میرے دل کا ہم نوا بھی۔ مشکل یہ تھی کہ بے بے کو کیسے رضامند کروں۔ باجی ساجدہ نے ان کی جس حرث کو بھڑکا دیا تھا اسے دھیما کئے کروں۔ ان کی مرضی کے خلاف جانا بھی میرے لیے ناممکن تھا اور ان کی ناں کو ہاں میں بدلتا بھی مشکل ترین تھا۔

\* \* \*

”کی گل اے شزادے، بڑا بجھا بجھا سا بیٹھا ہے۔“  
چاچے کے پاس یونہی اٹھ کے چل دیا تھا۔ شادی باجی ساجدہ سے جان چھڑانے کے لیے اور اب وہاں بھی الھڑا الھڑا سا بیٹھا تھا۔ میری بے سکونی ان کی نظرؤں سے بھی چھپنے سکی۔

”ساری بیاں ہو گل ہو گئی ہیں۔“ میں نے اپنی بے بی کا مذاق اڑایا۔

”خیر ہوئے بابو، یہ فیوز کس نے اڑایا؟“ رانی مکر جی اپنا لنجا سنبھالتا میرے ساتھ آکے بیٹھا۔

”اوپر اس ہٹ کے بیٹھ۔“ چاچے نیم پاس نے گھر

میں نے اپنا رویہ جان بوجھ کے روکھا پھیکار کھانا کر کر وہ کسی خوش فہمی میں نہ رہیں۔

”کیوں بھئی، اس جوان عمری میں دوسرے کام کھانا کیوں چھوڑ دیا؟ یہ اپنے سلیم کوی دیکھو۔“ انہوں نے اپنے بھائی کا نام لیا۔

”شادی کو دس دن ہو گئے ہیں، ابھی تک ناشتہ اس کے سرال سے آتا ہے۔ حلوہ پوری، نماری مرغ پختے، پیڑوں والی کسی، ہم سارے پیٹ بھر کے کھاتے ہیں اور دوسرے کو بھر سے بھوک لگ جاتی ہے۔“

”خیریت ہے؟ یہ ناشتہ سلیم کی سرال سے کیوں آتا ہے؟ کیا باجی ساجدہ ناشتہ بنانا بھول گئی ہیں؟“ میں نے تیکھے پن سے پوچھا۔

”بھئی، یہی تو وقت ہے سرال والوں سے خترے اٹھوانے کا۔ میرا ناشتہ ایک مینے تک آیا تھا۔“ انہوں نے فخریہ بیان کیا۔

”بھئی میرے سرال والوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جتنی عزت وہ داما دوں کو دیتے ہیں۔ جتنا خیال وہ بیاہی بیٹیوں کا کرتے ہیں کوئی اور نہیں کر سکتا۔“

اب میرا شکر یعنیں میں بدل گیا۔ وہ یقیناً ”اپنی بیگم کے کھنپے پہ ہی میری مٹی زم کر رہے تھے۔ مجھے اپنی سرال کی جانب راغب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”لوگ تریاں لگا کے۔ سرال والوں بے مال بثورتے ہیں۔ مجھے اللہ کے فضل سے آج تک تڑی لگانے یا بیوی کو دھمکی دے کر سرال بھجنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ اتنے بھلے لوگ ہیں کہ بھی اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔ یہ نفیس حاکم کا کرتادیکھ رہے ہو۔ ایسے چار کرٹے ہر سال گرمیوں میں کڑھ کے آتے ہیں۔ چیزِ میں لہنے کے شلوار سوتِ سل کے آتے ہیں۔ سرالوں کے گرم کپڑے الگ بیٹی اور نواسوں کو جو دیتے ہیں وہ الگ۔ بھئی ان کا داما خرچ اور منگالی کی فکروں پریشانیوں سے جتنا دور ہو گا۔ ان کی بیٹی کو اتنا ہی خوش رکھ سکے گا ان۔ جو بندے سارے دن کھپ جاتے ہیں، گھر آکے یوں بچوں سے کیا خاک مشینی بات کریں گے۔“

میں بے رغبتی سے سریلا تارہا۔

”سلیم کی مثال لو۔ ہاں برا کھلا جیز دیا انہوں نے مگر نہ کھتے سال کام آتا ہے۔ سرال والے وہی اپنے جو عمر بھرا تھے پہنچے رہیں۔ تمہیں نہیں پتا، شادی کے بعد میں

گے۔“ ”ناچاچا“ یہ برا مشکل کام ہے۔ ”گرو نے اندر سے آواز لگائی۔

”چھپلی گلی میں سارے منڈے چھڑے چھانٹ رہتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کے ایک آوارہ“ لوفر اور بد معاش.... آتے جاتے میری بچیوں کو چھیڑیں گے۔ آوازیں کسی گے یہ کام نہیں چلے گا۔ ہم نے جب یہ مکان کرائے پے لیا تھا تو اسی دروازے سے اندر آئے تھے۔“

”اور چنگا پھنسا ہوں میں....“ چاچا بھنا کے کھڑا ہو گیا۔

”زنایاں رکھ لو تو یہ محلے دار نہیں جینے دیتے۔ منڈے رکھ لو تو اعتراض کرتے ہیں کہ چھڑا کرائے دار کیوں رکھا ہے۔ دھی بہن والے محلے میں اور اگر سارے ربھیڑ مٹکانے کے لیے یہ کرائے دار رکھے ہیں تو ان لوگوں کو تکلیف ہے۔ اور سے یہ بھی اکڑ دکھارے ہیں مجھے۔“

میں اپنا دھیان پٹانے یہاں آیا تھا، لیکن ادھر اپنی کلیکل شروع ہو چکی تھی۔ آتا کے نکلا تو گلی میں ہی بھا خیف کے لڑکے نے دھر لیا۔

”آپ کو ابو بارہ ہے ہیں۔“

میں شاید ادھر ادھر تھک جاتا، مگر وہ سائے کی طرح ساتھ لگ کے مجھے اپنے ابو تک لے گیا۔ جو سرکاری نوکری کے مزے لوٹے ہوئے چھٹی، منار ہے تھے اور اپنی بیٹھک میں بیٹھنے تیل لگوار سے اور مالش کروار ہے تھے اور یہ خدمت انجام دینے والا کوئی اور نہیں، انجمن یا اشرف نانی یہ جراتا۔

”ارے آؤ یار، تم نے تو شکل رکھانی چھوڑ دی۔ آؤ بیٹھو، کیا چلے گا؟ گرمی سے شرست پی لو۔ بلکہ بول، منگو اتا ہوں۔ اوئے جا، دبو ملیں پکڑ کے لا۔“

میرے نانا کرنے کے باوجود انہوں نے میٹے کو بھاگایا۔

”آج تو دوسرے کا کھانا بھی میرے ساتھ ہی کھانا۔ تمہاری باجی نے کوئی نہیں بنائے ہیں ساتھ میں کڑھی پکڑا۔“

اب مجھے لگا کہ یقیناً وہ اس غیر ضروری التفات کا مظاہرہ اپنی بیگم کی بدایت پہ کر رہے تھے۔ درنہ ان کا تعلق کمینوں کے اس گروہ سے تھا جو کچھ کھارے ہوں تو کسی کی آمد پہ نہ صرف پلیٹ پچھے چھیڑا لیتے ہیں، بلکہ منہ میں رکھا نوالہ چبائی کی بجائے ثابت نگل جاتے ہیں۔

”جی نہیں شکریہ، میں دوسرے کا کھانا نہیں کھاتا، آپ نے کسی کام سے بلا یا تھا مجھے۔“

اس گلی میں قدم رکھا تو... نانگ تڑا دوں گا۔ پچھلی طرف سے آنا جانا رکھو۔“

”کیوں؟“ اشرف نے کاندھے پر رکھا رومال روپئے کی طرح گلے میں ڈالا اور لڑاکا، ہماسیوں کی طرح کرپہ ہاتھ رکھ کے پوچھنے لگا۔

”اس لیے کہ ہم بھروسے ہیں۔ خرے ہیں، اور تم تمہارا بھائی اور یہ باقی سارے مرد ہیں؟ ڈوب مرد، خرے تم لوگ ہو جو اپنے ہاتھ پیر ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی آس اور مرد پر زندہ ہو۔ تم نامردوں سے ہم بھلے جوانی روپی اتنے مل بوتے ہے تو کلتے ہیں۔ مجھے دیکھو... گردنے کا آپ تھیں ہوا ہر ناچ کا ہوا۔ اب ملے ہوئے پیٹ کے ساتھ ناچ گانا نہیں کر سکتی۔ لیکن بیٹھ کے مفت کی روپی توڑنا گوارا نہیں مجھے۔ تم جیسے ہڈ حراموں کی ماش کر کے اور مٹھی چاپی کر کے دس دس بیس بیس روپے کماتی ہوں تاکہ روپی کھانے کا سواد تو آئے۔ میری ساہی سیہلیاں اور گرد کھانے کا سواد تو آئے۔“

”میری ساہی سیہلیاں اور گرد کھانے کے فیض نہیں کہ مجھے روپی نہ کھلا سکیں۔ لیکن کیا کروں۔ بھروسہ ہوں اس کے باوجود غیرت مر نہیں سکی۔ مفت کے نوازے کا سواد ہی نہیں آتا اور، اور بغیر سواد کے تو ترنوالہ بھی اندر جائے تو کیا فیدہ۔“

اچانک اس نے اپنے مخصوص انداز میں زور دار آواز کے ساتھ تالی بھائی۔

”ہم تو اسی گلی میں سے نکلیں گے۔ گردن اٹھا کے نکلیں گے۔ منہ چھپا کے تم اندر بیٹھو۔ سرکی کمائی پر پلنے والے نامرد تو تیرا بھائی اور تیرے جیسے دوسرے مفت خورے بھیک منکے مل کے ٹولی بنالو، جیسی ہماری ہے۔“

اس کے بعد جو بھا خفیف کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلا، اشرف کو وہاں سے بدعاً میں دیتے ہوئے بھا گناہی پڑا، لیکن اس کے جانے کے بعد بھی وہ مجھ سے نظر نہ ملا سکے۔

”اگر اشرف کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے آپ کا اس قسم کی ٹولی بنانے کا ارادہ ہے بھی تو مجھے معاف رکھیں۔ میں اس صفت میں شامل نہیں ہونا چاہتا، جہاں کھڑے ہو کر مجھے اپنی ہی اولاد کے سامنے سر جھکانا پڑے۔“

میری بات پر انہوں نے پٹ کے دیکھا۔ بیٹھ کے دروازے پر ان کے پیچے لا سن بنانے کے کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

”غور سے دیکھیں بھا خفیف! ان میں آپ کی تین

نے ڈیڑھ سال بے روزگاری کا بھی کام تھا ہے۔ وہ بچے بھی تھے تب۔ میرے سرال والوں نے زراپتہ نہ چلنے دیا کہ میرے پاس کوئی کام نہیں۔ جیب میری تب بھی بھری رہتی تھی۔ بیٹتے کے بیٹتے میرا سر آنکے فریج پھاؤں اور گوشت سے اور الماری انداج اور دوسرے سامان سے بھر رہتا تھا۔ یہ نوکری بھی بڑے سالے نے لگا وائی۔ کوئی ذہنی لامکہ روپے کی رشوت اور خاصی تھوڑی سفارش لگا کر، برا لڑکا میز ک کر لے۔ اسے کاج میں بڑھانے کی ذمہ داری بھی اس کے نانے نے لی ہے۔ میں تو اس دن اپنی ساس کو سنا آیا تھا کہ آپ کی ایک ہی بٹی بیانے والی رہ گئی ہے۔ اسے رخصت کر کے ملٹھن ہو گئے میشیں۔ اس کے بعد اپنی نواسیوں کے لیے سوچیں۔ ان کے لیے جوڑ کے رکھیں۔ ان کے جیزیز کی فکر کریں۔“

”مگر وہ آپ کی بیٹیاں ہیں۔ آپ کی ذمہ داری آپ کا بھی تو فرض بتائے کہ۔“

”فرض ان کا بھی بتائے ہے آخر وہ نانا ہیں، ناموں ہیں، اور کم عقل انسان، تگڑے سرالیوں کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ اگر ان کے پاس کچھ ہے تو نچوڑتے رہو۔ آخر وقت تک نچوڑتے رہو۔“

ان کے زریں خیالات سن کر میرا دل کچھ اور کھٹا ہو گیا لیکن میں چپ رہا۔ میری خاموشی کو شاید وہ کچھ اور سمجھے کہ میں برا متأثر ہو رہا ہوں۔ میرے کاندھے پر زور کی دھپ لگائی۔

”اب عقل میں آئی ناں میری بات؟ یہ لے اشرف، یہ تیرے بیس روپے۔“ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک نوٹ نکالا اور اس بھروسے کی طرف بڑھا دیا جس کے چہرے کے تاثرات میرے چہرے کے تاثرات سے بھی زیادہ کڑوے ہو رہے تھے۔

”شکر ہے، مزدوری ابھی مل گئی درنہ میں تو سمجھی۔ یہ بھی اپنے سرے لا کر دو گے۔“

اس کے اس طعنے پر میں نے اپنی مسکراہٹ اور بھا خفیف نے اپنے غصے پر بڑی مشکل سے کٹھوں کیا۔

”زیادہ بک بک نہ کر، ایک تو ترس کھا کے تجھے یہ کام دیا۔ اس پر بڑھو کر تاہے۔ میں نے ماش کروانی شروع کی ہے تو دوسرے لوگوں نے بھی تجھے کام دینا شروع کیا ہے۔ درنہ کوئی ہاتھ نہ لگانے دے۔ اور بات سُن، تیری بات اور ہے لیکن اپنے ان دوسرے ساتھیوں کو کہہ دے۔ خبردار جو

باتیں کرنے والا مرکار طوطا۔ اور وہی نامعقول گدھا۔ شکر  
ہے کہ وہ خارش زدہ کتا کوثر پرور نے یہاں آنے سے پہلے  
ہی مار بھاگا۔ اگرچہ وہ بھی چاچا ٹیکم پاس کا کوئی کم لاڈلا نہیں  
تھا، لیکن کوثر کی شرط ہی یہی تھی کہ جس گھر میں کتا  
نجاست اور نخوست پھیلا آتا ہو وہ وہاں نہیں رہے گی۔ کاش  
کتے کی طرح یہ گدھا بھی بخس اور مکروہ ہوتا۔

”ان بے کار جانوروں کے علاوہ اب کوئی خاص قابل اعتراض بات نہ رہی تھی اس گھر میں۔ چاپے نے زندگی میں پہلی بار ہمارے آنے کے اہتمام میں جیب ڈھلی کرتے ہوئے ان بے رنگ و روغن دیواروں، دروازوں اور کھڑکیوں پر قلعی کروائی تھی۔ اکھڑا ہوا فرش ہموار کرایا تھا۔ باقی کسر کوثر کی صفائی، سترہائی کی عادت اور سلیقے نے پوری کردی ورنہ جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تب اپنے ہی اس جلد بازی میں کیے فصلے پر میں نے خود کو جی بھر کے کوسا تھا۔ شکر ہے صورتحال اتنی خوفناک نہیں رہی، جس کا خدشہ تھا بس یہ گدھے کا بچہ... یہ چاپے ٹیم پاسکی ناک والا طوطا اور یہ مرغیاں، یہ بھی کمیں غائب ہو جائیں تو مزہ آجائے۔

”آپ سورج رہے ہوں گے کہ اشرف اور رانی کی پارٹی  
کو نکال کر میں نے چاچے شیم پاس کے گھر پہ قبضہ کیا اور وہ  
بھی کوثر کے ساتھ؟ یہ بھڑوں کی اس نولی کا یہاں سے جانے  
کا فیصلہ اپنا تھا اور چاچا شیم پیس جس کا اس عمر میں اکیلے  
گزارا نہیں ہوتا تھا۔ سخت پریشان گہرے کہ اب کہاں سے نیا  
کرائے دار ڈھونڈے۔ ایسے میں ایک دن اس نے میرے  
سامنے کھڑا۔

”اب تو آدھے کرائے پہ بھی کوئی ڈھنگ کا بندہ ملا تو رکھ لوا اگا۔“

”آدھا کرائے؟“

”ہاں... تے شک ہزار ہی دے دے، لیکن تین جہاز  
جننے کروں میں اگلے نہیں رہا جاتا۔ میں مر گیا تو شاید چار دن  
بعد میری بدبو سے ہی محلے والوں کو میری موت کا پتہ چلے  
گا۔“

اس نے خاصی رقت کے ساتھ کہا مگر میرا دل موم  
ہونے کی بجائے خباثت سے مسکرا اٹھا۔

”مشکل ہی ہے۔ چار دن بعد بھی شاید ہی کسی کو پتہ چلے۔ کیونکہ یہاں سے گزرتے ہوئے پہلے ہی سب ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں۔“

بیٹیاں ہیں۔ رسم و النابت آسان ہے اسے نبھانا مشکل، آپ نے داماد پالنے والی رسم ڈال تو لی، آپ کے سر صاحبِ جائیداد اور خوشحال ہیں، انہوں نے تین تین داماد گودلے کر کر یہ رسم مقدور بھر بھا بھی دی۔ لیکن کیا آپ ایک داماد بھی افورد کر سکیں گے اور وہ بھی اپنے جیسا۔ انہیں سوچنے کے لیے ایک سوال دے کر جب میں دیاں سے نکلا تو میرے اپنے پاس سوچنے کے لیے اب کچھ نہیں رہا تھا۔

## دُرْدَنْدَلْ

حسبِ معمول میری آنکھ مرغیوں کے اس شور سے  
کھلی۔ اب یہ آواز اور بھی نزدیک سے آتی ہے۔ صرف  
آواز ہی کیوں... اگر انھنے میں دری ہو جائے تو میری زوجہ  
محترمہ ایک عدد مرغاں اٹھا کے میرے بستر پر چھوڑ دیتی ہیں۔  
جو نہ ہو نکلیں مار مار کے بالآخر مجھے چھلانگ مار کے اتنے پر  
مجھوں کرہی دیتا ہے۔

”کبھی مجبواؤں کی طرح بھی جگایا کرو ظالم۔“ مرغی کی سلسلہ چورچ مازی سے ٹنگ آکے میں انھر بیٹھا اور ایک بھر بور انگڑا لی لئتے ہوئے شکوہ کیا۔

”مثلا“ کیسے؟“ کوثر نے جھاڑو پھر تے پھیرتے رک  
کے مجھے تیکھی چتوں کے ساتھ گھورا۔

”اوی... مثلاً“ میں آنکھیں بیچ کر سوپتے کی ایکٹنگ کرنے لگا کہ اچانک اندر سے چاچا یم پاس کائیپ ریکارڈر بج انہا اور پیری مشکل آسان کی۔

”اک پھل موتیے دamar کے جگاؤ ہنئے۔“  
”ہاں ایسے... ایسے جگاؤ کبھی۔“  
”موتیے کا پھول مٹے تو سکی.... یہاں تو نزے نہم کے  
نبولے ہیں۔ ہلکا سا بھی مارا تو ہائے ہائے کرتے رہو  
گے۔ آرھا گھنٹہ۔“

وہ ایسے بولی جیسے نیم کی نمبولی ہی تو چباکے بیٹھی ہو۔  
 ”سب ماحول کا اثر ہے۔“ میں بیرداستی ہوئے انھا اور  
 شقیدی نظرؤں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ واقعی اس ماحول  
 میں بھلا کوڑاں رومنویت جھاڑے گا۔

وہی جھاڑ جھنکارٹے سے بدشکل پودے۔ وہی گندے پانی کا  
وض، جس میں تیرتی بھدی آواز والی بطنخیں۔ وہی منہوس

سے ملنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ آپ بھی پری صورت دیکھنے کو ترس جائیں گی۔ اور کوئی جیزرو ہیز نہیں ملتے والا۔ جب وہ مجھے ہی رخصت کروائے لے جائیں گی تو آپ کے پاس کیا آئے گا۔ الٹا بیٹھا بھی ہاتھ سے جائے گا۔

بات ان کی سمجھتے ہیں آگئی۔ انہوں نے کوثر پر ہی صبر شکر کیا کم از کم وہاں سے کچھ کی تو امید تھی انہیں۔ میں نے یہ امید توڑنا فی الحال مناسب نہیں سمجھا۔ البتہ دل ہی دل میں پکا عمد کر لیا ہے کہ مجھے اپنی بہنوں کو بیانہ ہے۔ عزت سے بیانہ ہے۔ مگر اپنے مل بوتے پہ۔ اپنے زور بارو پہ۔ اور اپنے ہی جیسے کسی نوجوان سے جونہ تو تن آسان ہونہ شارت کٹ کا متلاشی۔ جو گھر بھرنے کے لیے نہیں بلکہ گھر بنانے کے لیے شادی کرے۔

”ڈھنچوں.....ڈھنچوں۔“

میں پتہ نہیں کب تک اپنے ہی اس کارنامے پر مسکرا کر کے خود کو درستار تاکہ گدھے کی بے وقت کی رائجی نے خلل ڈال دیا۔

”کوثر! میں کسے دیتا ہوں، سمجھا لو اپنے چاچے ٹیم پاس کو۔ آج کے بعد اس گھر میں یا تو میں رہوں گایا یہ کھوتے را پڑ۔“ میں نے دھمکی دی۔

”ہائے اللہ... اتنی ٹھنڈی میں آپ کہاں رہو گے۔ سرتاج؟“

کوثر نے بھولپن سے آنکھیں پنپناتے ہوئے کہا تو میں منہ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگا۔ \*

”خنول کرتا ہے...؟ خدا کسی کو بذھے دیلے اکیلانہ کرے۔“

”آئین..... اور چاچا فکر مت کرو۔ تم بھی اکیلے نہیں رہو گے۔ بس اپنی اس بات پر قائم رہنا۔ یعنی ایک ہزار روپے کرائے والی بات۔“ میں نے جھٹ موضع سے فائدہ اٹھایا۔

میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی کی تاریخ مقرر ہوتے ہی میں یہاں اٹھ آؤں گا اور کوثر کو بھی رخصت کروائے پس لاؤں گا۔ میرے اس فیصلے کی سب سے زیادہ مخالفت یاسی نے کی۔ وہ میرے یہاں رہنے کے حق میں نہیں تھیں۔ ماما رحمت نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا کہ میں شادی کے بعد بھی یہاں ”آن ہی“ کے گھر میں رہوں۔ گھر داماد بن کے نہیں بلکہ اس وقت تک جب تک کہ میں کسی اپنے اور معقول مکان کو کرائے پہ لینے کی پوزیشن میں نہیں آ جاتا، میں جانتا تھا کہ ایسا بہت جلد ہو جائے گا۔ کیونکہ میں جہاں ملازمت کر رہا تھا وہ لوگ محنت اور قابلیت کی قدر کرنے والے تھے۔ میری ترقی ہو چکی تھی اور مزید کا مسلسل امکان تھا۔ پھر بھی میں ایک دن بھی گھر داماد کی حیثیت سے رہنے پہ تیار نہیں تھا۔

اشرف کا وہ طعنہ جو اس نے بھا خیف کو دیا تھا۔ پتہ نہیں اس پر اثر کر پایا یا نہیں، مگر مجھے تازیانے کی طرح لگا تھا۔ میں آج بھی اس بد مزاج اور بد زبان یہ جزو کا مشکور و ممنون ہوں۔ جس نے بروقت مجھے سمجھنے میں مدد دی۔ ورنہ شاید وہ ذہنی شکلش مجھے کوئی غلط فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیتی۔ کوئی ایسا غلط فیصلہ... جس کے نتیجے میں آج سے دس سال بعد مجھے بھی اپنی اولاد کے سامنے شرمندگی سے سر جھکانا پڑتا۔

میں نے اسی وقت ”مرد“ بننے کا فیصلہ کر لیا تھا، اور مردانہ وار ساری صور تحال کو ہاتھ میں لینے کا ارادہ بھی؛ بے بے کو ان دلیلوں کے ذریعے رضا مند کرنا مشکل تھا، اس لیے فقط اس مقصد کے لیے میں نے تھوڑی سی زنانہ چال چلی، یعنی باجی ساجدہ کے عزائم کو توڑ مروڑ کے ان کے سامنے پیش کیا۔

”وہ مجھے گھر داماد ہی نہیں، گھر بہنوی بنانا چاہتی ہیں۔ گھر داماد تو ساس سر کی شفقت کے سامنے میں رہتا ہے۔ وہ مجھے اپنی اور اپنے میاں کی مشی میں رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کے میاں کو ان کی اجازت کے بغیر اپنے ماں باپ

## خواہیں دا مجھست

کے خوبصورت ناول شائع ہو گئے ہیں

” ستاروں کا آنگن“ نسیم سحر قریشی  
قیمت 300/- روپے

”ڈھلے چامز دل کے پار“ ثمرہ بخاری  
قیمت 300/- روپے

” اے وقت گواہی دئے“ راحت جیں  
قیمت 300/- روپے

” ہنگوں فتے کا پتہ ہے  
مکتبہ عمران دا مجھست  
37 - اردو بازار کراچی سے۔